Mhau

Mitto

Waini

Mano

The University of Kashmir, Iqbal Library

Call No.— — — —   Acc. No.— — — — —

1. An overdue charge of 10/20 Paisa will be l
for each day, if the book is kept beyond
date stamped above.

2. Writing / Marking on the pages of a
with ink or pencil, tearing or taking
pages or otherwise damaging it, will c
an injury to the book.

3. Any such injury to a book is seriou
Unless a borrower points out the
the time of borrowing the book, he/s
held strictly responsible for it.

تنقید و نقّاد

انجمن تاجران کتب

ضیا عظیم آبادی

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے

شائع ہوئی

(اتر پردیش)

Allama Iqbal Library
258089
258089
24-11-86

ضیا پبلشنگ ہاؤس۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

• پرنٹر:۔ الواعظ صفدر پریس

• پبلشر:۔ ضیا عظیم آبادی۔

ضیا پبلشنگ ہاؤس، ۲۵۔ گولہ گنج مقبرہ لکھنؤ

• سنہ اشاعت:۔ ۱۹۸۳ء

• بارِ اوّل:۔ چھ سو

• قیمت:۔ بیس روپے

یکے
از مطبوعات

ضیا پبلشنگ ہاؤس
۲۵ مقبرہ گولہ گنج۔ لکھنؤ

شرمندہ کیا جوہر بالغ نظری نے
اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے

(وحشتؔ کلکتوی)

مُصنّف کی ادبی خدمات

- ادب اور جنس (انعام یافتہ)
- مرزا یگانہ چنگیزی۔ حیات و فن (انعام یافتہ)
- شاد عظیم آبادی پر ایک نظر (انعام یافتہ)

ان کے
علاوہ
دیگر ناول

- گلابی رات
- کھنکتی چوڑیاں
- کورا آنچل
- خیال کے گیسو
- بُت کدہ
- پھولوں کی سیج
- ریشمی آنچل
- ساگر
- انجام
- بانہیں
- انگڑائی
- آنکھوں آنکھوں میں
- ساقی
- دھانی دوپٹہ
- مدینہ سے کربلا تک
- تصادم
- کروٹیں
- وغیرہ وغیرہ

بزرگ محترم

مالک رام کی خدمت میں

اور

سالک لکھنوی (کلکتہ) جن کی ہار لغ نظری نے

مجھے ہمت بخشی۔

عقیدتمند

ض۔ع

پانچ ابواب

(۱) تنقید و نقاد

(۲) عرفانِ آگہی

(۳) فرائڈ اور ادب

(۴) دیدۂ بینا

(۵) شعورِ نظر

حرفِ اوّل

تنقید اور نقاد حاضر ہے — محض پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور کوئی طویل، منطقی بحث نہیں۔

یہ میری ایک ایسی کوشش ہے جسے آپ حقیقت بھی کہہ سکتے ہیں — اور جرأتِ اخلاق کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ میں نے اصولی نقد و نظر میں نہ کوئی اضافہ کیا ہے نہ اپنی معلومات کا رعب ڈالنا چاہا ہے۔ مرعوب کرنے والوں کی کمی نہیں ہے اور اصولی بحث کرنے والے بھی کمیاب نہیں ہیں۔ پھر ایسی راہ پر چلنا کون سا کارِ نمایاں ہوسکتا ہے؟۔ ہماری زبان اور ادب میں یہ روش اتنی عام ہے کہ اب کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے اور بسا اوقات کچھ لوگ بھی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ کیا سائنسی اقتصادی اور معاشی مسائل تک ہمارے اربابِ قلم کی نگاہیں نہیں پہنچتیں کہ جس کو دیکھئے ایک ہی راہ پر گامزن ہے۔ دورِ حاضر کے مطابق بھی تو کچھ لکھنا فرض ہے "تاکہ اُردو کی وسعت آشکار ہوسکے۔ اور فخر سے سر اٹھا کر کہا جاسکے کہ ہمارے لکھنے والے نہ تنگ نگاہ ہیں نہ محدود"۔ میں نے بصد خلوص اسی طرف اہلِ فن کو متوجہ کرنا چاہا ہے۔ اسے وہ گستاخی سمجھیں یا چھوٹا منھ بڑی بات۔ میرے جذبۂ اخلاص پر کوئی آنچ نہیں آتی —

اُردو ادب بچپن سے میرا موضوع رہا ہے۔ اور میں اس کا قائل نہیں کہ جس موضوع سے پوری واقفیت نہ ہو اس میں اپنی ٹانگ اڑائی جائے۔ ورنہ ممکن تھا، عمرانیات وغیرہ پر گفتگو کرتا۔ تھوڑا بہت پڑھ لینے سے اور سرسری مطالعہ کرنے سے اور بھر کد و کاوش کے ہوتے ہوئے ہمارے یا آپ کے لیے یہ منصب

سے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ لب کشائی کی جائے۔ بات اسی حد تک کرنا مناسب ہے جس حد تک ریاضت و محنت کے صلہ میں واقفیت میسر ہوئی ہو۔ میرے جاننے والے بخوبی جانتے ہیں کہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی شعروادب میرا مشغلہ و پیشہ ہو گیا ـــ میں نے افسانے بھی لکھے۔ تجویز کردہ ڈرامے بھی اسٹیج ہوئے۔ اردو کا معلّم بھی رہا۔ ناول بھی پیش کیے۔ اور بقول غالب۔ ع

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

میں نے ہر محاذ پر نقاد حضرات کے جلوے دیکھے ہیں۔ مجھے ان کا تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ و مطالعہ بھی ـــ اسی لیے اپنے کو اس کا مستحق سمجھتا ہوں کہ ایک ایسا آئینہ پیش کروں جس میں وہ بآسانی اپنے چہرے دیکھ سکیں ـــ چونکہ یہ قدم اٹھانے والا نہ ماضی میں کوئی دکھائی دیتا ہے نہ مستقبل میں۔ برادری کے احترام میں ایک دوسرے سے کچھ کہنا گوارا نہیں کرتا اور طرّہ یہ کہ بعد میں خود بھی مدرس بن کر تنقید کے فرائض انجام دینا اپنے لیے واجب سمجھتے ہیں۔ اُستادوں کی آواز سے آواز ملانا سعادت مندی کی دلیل خیال کرتے ہیں۔ شاید میں اس روشِ عام پر چل نکلتا۔ لیکن کبھی چاہ و منصب کی تمنا ہی نہیں رہی۔ معاشی اعتبار سے بھی آگے بڑھنے و مستحکم ہونے کا خیال ہی نہیں پیدا ہوا ـــ ؟ ممکن ہے مجھے ترقی کرنا گروپ بنانا کسی حلقے میں شامل ہونا اور روپے پیدا کرنا آتا ہی نہ ہو یا میرے مقدر میں نہ ہو پھر اپنے ضمیر کی آواز کیوں دباؤں ؟

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جناب کوئی خدائی فوجدار تو ہیں نہیں۔ یا سارے جہاں کا درد فطرت نے آپ ہی کو تو دے نہیں دیا ہے۔ آخر اور بھی تو لوگ ہیں۔! تو میں عرض کروں گا کہ خوفِ فسادِ خلق سے زبانوں میں تالے پڑ گئے ہیں اور بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ کوئی بھی کسی سے بُرائی مول لینے کو تیار نہیں ہوتا اور

پہلے کے لوگوں نے جس قدر بھی جس کے لیے اظہارِ خیال کیا ہے اس کو حرفِ آخر سمجھ کر گیا ہے۔ ع

کچھ لوگ جو خاموش ہیں یہ سوچ رہے ہیں
سچ بولیں گے جب سچ کے ذرا دام بڑھیں گے

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی بھی اپنے لبوں کو جنبش نہ دے؟ ایسے موقع پر چپ رہنا جب مغالطہ یقین کی صورت اختیار کر رہا ہو مستقل غداری ہے۔ ہر سیمنار و اجتماع میں ان ہی لوگوں کو مدعو کیا جانا جن کا یہ خیال ہو کہ ع

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ایک ایسی فضا قائم ہوتے ہوئے دیکھنا جس میں یہ عقیدہ استحکام کی منزلوں میں داخل ہو چکا ہو کہ جب تک کوئی ہمارے مقام پر نہیں پہنچتا ہے اساتذہ کی صف میں شامل نہیں ہوتا ہے زبان و ادب کے معاملہ میں کتنی ہی خدمت و خامہ فرسائی کیوں نہ کرے وہ اعتبار و اعتماد حاصل نہیں کر سکتا، سراسر بدعت اور اخلاقی گناہ ہے۔ اساتذہ سے بھی چوک ہو سکتی ہے اور بڑے بڑوں کے قدم بھی لڑکھڑا سکتے ہیں ــ اپنے آپ کو نہ پہچاننا اور اپنی صلاحیتوں کا منصفانہ جائزہ لیے بغیر عمل کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فطرت نے کسی کو دیگر کاموں کے لیے بنایا ہو اور وہ خود تنقیدی کو ناپسند کرتے ہوئے خلافِ فطرت نقل و حرکت کر رہا ہو تو بجائے دنیائے رنگ و بو میں اضافہ ہونے کے تکرار و محض تکرار کا دور دورہ ہو جائے گا۔

جب ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اپنا محاسبہ آپ کرنا ممکن نہ رہے تو علم و آگہی کے ارتقاء کے لیے دوسروں کو محاسب بن کر سامنے آنا لازم ہے ــ چونکہ ہم شخصیت پرستی کے لیے خلق نہیں کیے گئے ہیں بلکہ علوم و فنون اور زبان و ادب کی بقاء کے لیے معرض وجود میں آئے ہیں۔

یہ تو کسی مہذب انسان کا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ وہ دل آزاری کو پسندیدہ سمجھے لیکن اس قول کے پیش نظر کہ "یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کیا کہہ رہا ہے۔ اپنے منصب کا لحاظ رکھنے کے لیے تو توجہ دلا ہی سکتا ہے؟۔ اور اس سے نہ اس کی نیک نیتی پر شبہ کیا جا سکتا ہے نہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ارباب وقعت کے ذریعہ سطحی و سستی شہرت کا طلبگار ہے۔ بلکہ جائز طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس نے عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ گوارا نہ کیا کہ صاحبان عظمت اپنے بلند مقام سے ایک انچ بھی نیچے آ جائیں اور بکمال عقیدت میں اوچھے ہتھیاروں کا وار تک سہنے کے لیے بھی آمادہ ہو گیا۔

نقاد کی حیثیت انتہائی پُر وقار ہوتی ہے اسے قدم قدم پر اپنی عظمت کا آپ احترام کرنا واجب ہوتا ہے ـــ اور پہلے ہی قدم پر اپنے کو تول لینا لازم ہوتا ہے کہ ہم جو بار اپنے کاندھوں پر اُٹھا رہے ہیں اس کے متحمل بھی ہیں یا نہیں؟۔ اصول ۔ قواعد ۔ ضوابط ۔ بہت کچھ مدون ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے محض ان سے واقفیت یا ان کا برتنا کافی نہیں ـــ بلکہ اپنے فرائض کو سمجھتے ہوئے عمل کرنا حقیقی معنوں میں زندۂ جاوید بناتا ہے۔

میں نے اپنے طور پر بنائے اخلاص صرف اتنا ہی چاہا ہے کہ نقاد کا واقعی رول کیا ہے۔ یاد دلا دوں ۔ اگر اس نیکی کا پھل بُرائی ہو تو بجائے افسوس کے یہ کہنا پڑے گا کہ ع

"کوئی حریف بھی اپنا مزاج داں نہ ملا

جناب آل احمد سرور نے ایک مقام پر تحریر فرمایا ہے کہ
"اب بھی کچھ لوگ قدیم ادب یا صرف جدید ادب کے پرستار ہیں ۔ یہ بات ایک اچھے نقاد کے منصب کے خلاف ہے۔ اس کا پہلا کام ترجمانی ہے ۔ پھر انصاف ۔ وہ ہر شاعر و افسانہ نگار

کے آگے بھی رہے اور ساتھ بھی ۔"

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آگے رہنا کیوں ۔؟ وہ کوئی رہنما تو ہے نہیں جو فن کار کو راہیں بتائے ۔ اور اگر اس کی اس حیثیت کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو ان عظیم مُردہ اہل فن کی وہ کیونکر رہنمائی کر سکے گا جو صدیوں پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں؟ نقاد کا منصب یہ نہیں ہے کہ وہ شاعر و ادیب کی کاوش کے بارے میں یہ کہے کہ ان کو ایسا ہونا چاہیئے تھا ۔ یا یوں ہونا چاہیئے ۔۔ پھر تو اس کا رشتہ ارباب فن سے اُستاد و شاگرد کا ہو جاتا ہے اور یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہر عہد میں یہ قابل قبول بھی ہے یا نہیں ۔۔ اور تمام لوگ چند حضرات کو معلّم بنانے پر تیار بھی ہیں یا نہیں ۔؟

البتہ یہاں تک بات بڑی جچی تُلی اور دل لگتی ہے کہ نقاد کا منصب ہے ترجمانی ۔ انصاف اور فنکار کے ساتھ ساتھ رہنا ۔ اسی لیے اس کے بارے میں بجا کہا جاتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ علوم و فنون سے آشنا ہونا چاہیئے ۔ اور غیر جانبدارانہ انداز میں فیصلہ کرنا چاہیے ۔ نقاد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ جس مدرسہ کا وفادار ہے اور جو کسوٹی اس کے لیے پسندیدہ ہے سب کو اسی پر پرکھنے کی کوشش کرے اور اپنی لیاقت و قابلیت کے زعم میں ثابت کرے کہ وہ بھی اس کے ہم نوا اور تھے اپنے عہد کے ماتحت اس کے ہم خیال و ہم مشرب تھے ۔ اور یہی ان کی بلندی کی نشانی ہے جملہ ارباب قلم میں نہ یکسانیت ممکن ہے نہ زمانے کے اثرات مساویانہ حیثیت سے سب پر ہوتے ہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو غالب و ذوق میں فرق کیوں پایا جاتا ہے اور مومن و ظفر کا انداز فکر جداگانہ کیوں ہوتا ۔ ہر شخص وہ فنکار ہو یا غیر فنکار اپنے گھرانے اپنے گرد و پیش اپنے احباب اپنی تعلیم و تربیت اور اپنے ماحول سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے ۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ بقدر نمک ہی سہی موروثی اثرات

بھی اُس میں ہوتے ہیں۔ تیر ایک صوفی مشرب باپ کے بیٹے تھے۔ ان کے کانوں میں ابتداء سے حسن و عشق کی باتیں پڑیں۔ مذاق جمالیات خون میں رسا بسا تھا اور دل کے ساتھ ساتھ چلنا بزرگوں سے ورثہ میں ملا تھا لہذا یہ غایت پستش قرار دے کر اُن کے اشعار میں تفریق پیدا کرنا اور پھر عطار سے دوائے دردِ دل طلب کرنے کو خواہ مخواہ معاشرے کی دین ثابت کرکے یہ بتانا کہ فنکار کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج کا ترجمان ہوتا ہے۔ سراسر خلاف حقیقت۔ اور زور و زبردستی کی کارفرمائی ہے۔

"اندرے زید" کا کہنا ہے کہ فنکار تجربات و حالات سے کم اور اپنی دبی ہوئی خواہشات کی تسکین کے لیے زیادہ عمل کرتا ہے"۔

لہذا انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم اسی کے معیار پر اسے جانچیں۔ اگر ہمیں اپنے منصب کا احترام ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندو دیومالائی فن پاروں میں اسلامی قدریں ڈھونڈ نکالیں اور قدیم یونانی اساطیری کہانیوں میں اپنے مذاق کی تلاش کرنے لگیں۔ کمال فن اور خوبی یہ ہے کہ جس کا جو زاویہ نظر رہا ہے اس سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو کر ہم بتائیں کہ اپنے اعتبار سے اس کا کیا درجہ تھا اور کہاں تک قابل قدر ہے۔

تنقید کا مختلف خانوں میں تقسیم ہو جانا قطعی عیب نہیں۔ علوم و فنون کی واقفیت نے نفسیاتی۔ سائنسی۔ معاشرتی۔ اقتصادی الغرض بہت سے دریچے کھولے ہیں اور یہ انتہائی عمدہ بات ہے۔ البتہ ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ صحیح ترجمانی اور انصاف سے قدم قدم پر کام لے ــــ یہ بھی کوئی جرم نہیں کہ مطالعہ کی برکت سے کسی کا عقیدہ مارکس پر ہے۔ کوئی فرائڈ سے متاثر ہے یا کسی اور فلسفۂ حیات سے۔ لیکن یہ درست نہیں قرار دیا جا سکتا کہ حرف

اپنے پسندیدہ آئینہ میں کسی کو دیکھا جائے۔ اور باوجود صلاحیتوں کے بربنائے عصبیت وسعت نظری سے کام نہ لیا جائے ــــ نقاد یہ تو کہہ سکتا ہے کہ ہمارے اعتبار سے جو مدرسۂ فکر صحت مند ہے اس سے یہ صاحب فن غیر متعلق تھا مگر اس میں جو فن کارانہ خصوصیات تھیں وہ ہمیں متوجہ کرنے کا سبب بنیں۔ اس سے نہ اس کی اصابت رائے میں فرق آتا ہے نہ اپنے مسلک سے وفاداری مشکوک ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی لیاقت وعظمت کے نقوش کچھ اور اُجاگر ہو کر اس کی انفرادیت کو مستحکم کر دیتے ہیں اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر محض ایک رنگ کی عینک نہیں چڑھی ہوئی ہے بلکہ اس کی بصارت وبصیرت اس بلندی پر ہے کہ وہ مختلف زاویوں سے نظارا کر سکتا ہے اور جو جیسا کچھ ہے ویسا ہی بتا سکتا ہے۔ حالی سید احتشام حسین اور اسی قبیل کے نقاد حضرات کی اہمیت مُسلّم۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے طور پر بدلے ہوئے حالات میں جو شعر وادب کے لیے کسوٹی پسند کی اور بیرونی اثرات قبول کیے وہ باوجود گرانقدر ہونے کے یہ بھی عرض کرنے کی جسارت بخشی رہے ہیں ع

"ورائے جہاں کچھ جہاں اور بھی ہیں"

اس لیے میرے خیال میں نقاد کو اُس کے عظیم منصب کی طرف توجہ دلانا یقینی نیک کام ہے ــ اور میں نے اپنی اس مختصر سی کتاب میں اس کی کوشش کی ہے۔ اب آپ مطالعہ فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ میرا یہ اقدام مستحسن ونیک ہے، یا نہیں۔

میں ممنون ہوں فخرالدین علی احمد اکاڈمی کا جس نے اس کی اشاعت کے لیے مالیاتی تعاون دینا منظور کیا۔ اور میں اس لائق ہو سکا کہ آپ کے سامنے اسے پیش کروں اگر یہ اعانت بر وقت ہوتی تو شاید میں اپنی کاوش کو آپ کی بارگاہ میں حاضر نہ کر پاتا۔ میں ناشرین سے رشتہ توڑ چکا ہوں۔ ناول بھی شاذ ونادر ہی لکھتا ہوں

اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہوں — سلامی از دست حوپستند باد

خادم الادبا، ضیا عظیم آبادی گولہ گنج لکھنؤ

تنقید اور نقاد

اس میں شک نہیں کہ اردو اصناف ادب میں جس صنف نے غیر معمولی طور پر مدارج ارتقاء طے کیے وہ ہے "تنقید" ہم انگریزی اور دیگر بیرونی زبانوں سے فیضیاب ہو کر قطعی اس قابل ہو گئے ہیں کہ دنیا کی جملہ ترقی یافتہ زبانوں کے اعلیٰ تنقیدی کارناموں کے مقابلے میں سر اونچا کرکے اپنی تنقیدی کاوشوں کو رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا دوسرا رخ کسی قدر المناک اور تکلیف دہ بھی ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ تنقید بھی ایک تخلیقی عمل ہے اور خلاقانہ صلاحیتیں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ درسی تعلیم اور مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ہم بہت سے منہ کی اُگلی ہوئی باتوں کو دہرا کر اور یکجا کرکے اپنی وسعت النظری کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن ایک حقیقی نقاد کا رول ادا نہیں کر سکتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نقاد کا رول کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تنقید تحقیق نہیں ہے۔ مصحفی کس کے شاگرد تھے؟ غالب کا مکان کہاں تھا۔ انیس کے کلام سے جو سلام منسوب ہے، وہ ان کا نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ بتانا محقق کا تو کام ہو سکتا ہے نقاد کا نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ضمنی طور پر ضرورتاً اس طرح کی چیزیں وہ بھی پیش کر دے۔ حقیقتاً اس کا فرض یہ ہے کہ وہ فن کار کے قلب تک رسائی حاصل کرتے ہوئے یہ محسوس کرے کہ فن کارانہ عمل کس حد تک عہد ساز ہے ــــ وہ شریک خلوت بھی ہوتا ہے اور مخلص رہنما بھی۔ ظاہر ہے اس منصب تک

پہچانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں جس کے پہلو میں دل گداختہ نہ ہوگا۔ وہ دوسرے کے قلب کی چوٹ کو کیا خوشی کر سکے گا؟ بڑا ستم یہ ہوا ہے کہ ہر معلّم کو اُردو کا نقاد ہونا بھی ضروری خیال کر لیا گیا ہے اور جو بھی فارغ التحصیل ہو کر اساتذہ کے حلقے میں شامل ہوتا ہے وہ تنقید کو اپنی جاگیر سمجھ کر گھوڑا دوڑانے لگتا ہے۔ اس کی شکایت اس سے نہیں کی جا سکتی ہے۔ چونکہ ہر شخص اپنی ذات سے والہانہ محبت کرتا ہے اور شدت سے خوش فہم ہوتا ہے البتہ اس کا گلا اگر کیا جا سکتا ہے تو اس نسل سے جو ترقی یافتہ اور باخبر ہونے کی دعوے دار ہوتے ہوئے بھی یکسر فقیر ہے۔ اور یہ کہنے کی اپنی میں جرأت نہیں پاتی کہ ع

این سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ جملہ اساتذہ صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ یقینی اکثر و بیشتر بڑی خوبیوں کے مالک کہلائیں گے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ کلیہ قائم کرنا اور یہ خیال مستحکم کر لیا کہ تنقید مخصوص ہے معلمین کے لیے قطعی نقصان رساں ثابت ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ میر۔ غالب اور اقبال پر تو خاصا مواد جمع ہو گیا لیکن غالب شکن یگانہ میر کے حریف سودا اور اسی قبیل کے دیگر حضرات پر بہت کم کام ہوا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ میر غالب اقبال پر لکھنے میں دل و دماغ کو کوئی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی۔ اتنا کچھ موجود ہے کہ ذرا سی توجہ دینے سے کوئی گوشہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسروں کے ساتھ صورت حال برعکس ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مذکورۂ بالا حضرات جس بلندی پر تھے وہاں دوسرے دکھائی نہیں دیتے۔ لہٰذا شدت کے ساتھ نظر نہیں اُٹھی۔ تب بھی یہ دریافت کرنا حق بجانب ہوگا کہ گھما پھرا کر

سب کی فکر کا قافلہ ایک ہی منزل پر کیوں پہنچا۔ انسان تو متنوع اور مختلف الخیال ہے ایک کو جو چہرہ بھاتا ہے وہی دوسرے کے لیے ناقابل اعتناء ہوتا ہے آخر اس کا کیا سبب ہے کہ تنقید کے معاملے میں یہ تضاد تقریباً مفقود ہے اور سب مختلف لب و لہجہ میں ایک ہی بولی بول رہے ہیں۔ بظاہر اس کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔ یا تو ہم میں قوتِ تخلیق نہیں ہے ہم محنت سے جی چراتے ہیں اور اپنے پیش رو حضرات کے قدم بہ قدم چلے جا رہے ہیں یا خوفزدہ ہیں۔ اختلاف کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اس خوف میں مبتلا ہیں کہ بنے بنائے امیج پر چوٹ لگائیں گے تو جاہل قرار دیے جائیں گے حالانکہ نقاد کے پہلو میں "نطشے" کے مافوق الانسان کا دل ہونا چاہیے۔ وہ بت پرست نہیں بلکہ بت شکن ہوتا ہے۔ اس کا کام مفروضات پر ایمان لے آنا نہیں ہے بلکہ تلاش و تجسس ہے وہ سائنٹفک ذہن کا مالک ہوتا ہے اس کے لیے لعن طعن سے بے پرواہ ہو کر تیشہ اٹھانا واجب ہے۔ وہ فطرتاً فرہاد صفت ہوتا ہے اور جوئے شیر جاری کرنے کے لیے پہاڑوں کا کلیجہ چیر دیتا اب ذرا ہمارے نقاد ایمان سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ ان میں سے کتنے اس معیار پر اترتے ہیں۔؟ اقبال کی عظمت مسلّم لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ ہر فرد بذات خود ایک انجمن ہوتا ہے۔ مختلف صلاحیتوں کا اس میں اجتماع ناممکن نہیں اور علامہ بلاشبہ بیک وقت بیرسٹرایٹ لا۔ پروفیسر فلسفی مبلغ اسلام دانائے راز سب ہی کچھ تھے لیکن ہم ان کے تمام اوصافِ حمیدہ کو گڈمڈ کر کے پرکھیں تو کیا یہ صحیح ہوگا۔؟ بیرسٹرایٹ لا کے اعتبار سے ان کا درجہ کتنا بلند تھا یہ قانون داں بتا سکتا ہے۔ پروفیسر کی حیثیت سے وہ کس مقام پر تھے اس کا فیصلہ ماہر تعلیم کر سکتا ہے۔ مبلغ اسلام کی صورت میں ان کی کیا منزل تھی۔؟ علمائے دین ظاہر کر سکتے ہیں۔ فلسفی وہ کتنے بڑے

تھے؟ کوئی فلاسفر ہی بتا سکتا ہے۔ شعر و ادب کا نقاد تو ان کو صرف شاعر کی حیثیت سے پرکھنے کا حقدار ہے اس کے کمال کے ہم اسی وقت قائل ہوں گے جب وہ اپنے مرکز پر قائم رہے۔ اور ایک فن کار ہے۔ اس کی جملہ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمیں روشناس کرائے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ نقاد کی نگاہ وسیع ہونا چاہیئے اور اس کی نظر کم و بیش جملہ علوم پر ہونی چاہیئے لیکن یہ کہنے سے بھی باز نہیں آؤں گا کہ ڈارون کا فلسفۂ اضافیت ہو۔ کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت ہو یا فرائڈ کا مذاق تحلیل نفسی ان سب کی رسائی دربار شعر و ادب میں اسی حد تک جائز ہے جس حد تک اس کے اپنے مزاج پر آنچ نہ آئے۔ ایک وسیع النظر نقاد کا عمل مختلف علوم و فنون کا کشیدہ تو ہو سکتا ہے لیکن کسی خاص مکتب خیال کا ڈھنڈورچی نہیں۔ ہم فن کار سے فنکارانہ عمل کے خواہاں ہیں پروپیگنڈے کے نہیں۔ اور اسی کے ماتحت اس کی قدر کرتے ہیں۔ مرادآبادی ظروف کے نقش و نگار ہمیں متوجہ کرتے ہیں۔ پیتل تانبے یا مٹی کے حُسن سے آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں۔ ہو سکتا ہے سونے پر کسی نے بھونڈی گلکاری کی ہو اور راکھ کے ڈھیر پر پڑے حسین گُل بوٹے بنائے ہوں۔ تو ہم مواد کے پیش نظر کوئی قدر و قیمت مقرر نہیں کریں گے بلکہ دستکاری پر دام لگائیں گے۔ قطعی یہی صورت شعر و ادب کی ہے۔ مضمون انوکھا ہے یا گھسا پٹا۔ کفر و الحاد سے بھرپور ہے یا ایمان و یقین سے لبریز اس سے قطع نظر دیکھیں گے یہ کہ جس انداز میں کہا گیا ہے وہ کتنا مسحور کن اور دلکش ہے۔ "بانگ درا" میں جو فنکار اقبال ہمارے سامنے آکر اپنے حضور میں ہماری جبینیں عقیدت و احترام میں جھکوا لیتا ہے۔ وہ "ضرب کلیم" میں مقصدی و تبلیغی لبادہ اوڑھ کر کچھ ایسا ورزئی ہو جاتا ہے کہ ہمیں دل کے بجائے دماغ کو اس کے خیر مقدم کے لیے تیار کرنا پڑتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کسی نقاد نے بھی صاف طور پر یہ کہنا کبھی گوارا

نہیں کیا کہ ڈاکٹر صاحب بتدریج مقصدیت سے قریب ہوتے گئے اور عروسیِ شعروادب کو ثانوی درجہ دینے پر تیار ہو گئے۔ اسی طرح انیس کا بھی معاملہ ہے۔ علامہ شبلی سے لے کر آج تک ہر نقادان کے رُخِ روشن کو دیکھتا رہا ہے اور اسی پر مصر رہا ہے کہ وہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے واقعات کربلا کو اودھ کے فریم میں فٹ کر کے کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں دی کہ وہ ایک مخصوص عقیدے کے لوگوں کو متاثر کرنا چاہتے تھے۔ بلند ترین ذاکر تھے اور مجلس پڑھنا ان کا پیشہ تھا۔ سامعین کے مذاق و جذبات کا پورا احترام ان پر واجب تھا۔ انھوں نے رزمیہ (ایپک) لکھنے کی مطلقاً زحمت نہیں فرمائی۔ ہر اہلِ نظر جانتا ہے کہ رزمیہ (ایپک) کے لیے دو مقابلہ کرنے والوں کا ہم وزن ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن نہ تو انیس اعتقاداً یہ جرأت کر سکتے تھے۔ اور نہ ان کے سننے والے اس کی تاب لا سکتے تھے لہذا انھوں نے خیر و شر کی معرکہ آرائی اپنا نصب العین قرار دیا۔ بلاشبہ اس میں ڈرامائی عنصر بھی ہے۔ قوتِ شعر گوئی بھی ہے۔ مزاج میں رچا بسا تغزل بھی ہے۔ شریف اور جری گھرانے کی تصویر کشی کی صلاحیت بھی ہے۔ خواتین اور بچوں کے مہذب کردار کی عکاسی کا مادہ بھی ہے۔ منظر نگاری کا ہنر بھی ہے۔ تخیل و تصور کے سہارے بہت کچھ کہنے کا سلیقہ بھی ہے لیکن جنگِ کربلا کی رُوح اُجاگر کرنے کا ذوق نہیں ہے۔ اسی لیے ہمیں ان کے مرقع شہید کربلا کا وہ رُخ نہیں دکھاتے جو ان کی انفرادیت کا زندۂ جاوید ثبوت ہیں۔

کلیم الدین احمد و چار اور لوگوں نے اس طرح کی بات کہی ہے تو خود اُن کی تردید مقدم خیال کی گئی اور تنقیدی دنیا میں اس پر کچھ زیادہ کان دھرا نہیں گیا۔ حکومت اور سیاست کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کسی فنکار کی یاد منانے کے لیے کوئی ایک سال مخصوص کر دینا یا صدی کو اس کے نام سے منسوب کر دینا اپنے

مفاد کے ماتحت کیا جاتا ہے اور اس طرح کی قدردانی ہمارے لیے کوئی سند نہیں ہوتی ہے۔ نہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہم صرف ایک آنکھ سے نظارہ کریں اور دوسری آنکھ بند کرلیں۔ فکر کی گہرائی وغیر جانب داری اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور تصویر کے دونوں رُخ اجاگر کیے جائیں۔ نقاد کسی کا نقیب ہوتا ہے نہ حریف اس کی کاوش آنے والی نسل کے لیے ایک ایسی شمع ہوتی ہے جس کی بدولت سیاہ و سفید سب کچھ دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے اور کہیں پر لڑکھڑانے کی نوبت نہیں آتی ہے۔ کسی سے متاثر ہونا عیب نہیں۔ بغیر اچھے یا بُرے تاثر کے اظہار رائے ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن آنکھوں پر لال پیلی عینک لگا کر سب کچھ سرخ یا زرد بتانا یقینی شایان شان نہیں۔ تنقید ایک عمل جراحی ہے اور پہلے سے ذہن میں یہ طے کرلینا کہ ہم کسی کو نشتر لگا کر بے داغ بتائیں گے اور کسی میں ہزاروں کیڑے ڈھونڈ نکالیں گے اس میں منصب کو مشکوک کر دیتا ہے۔ عمل تو نیک کے ساتھ ہونا چاہیئے اور جو جیسا کچھ ہو ویسا ہی ظاہر کرنا چاہیئے۔ مگر تجربے اور شاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا انداز فکر بالکل مختلف رہا ہے۔ ہم نے روایات اور تعلقات کے ماتحت زیادہ تر رائے قائم کی ہے۔ ترقی پسند نقاد نے اگر رجعت پسند فنکار کے محاسن پر توجہ نہیں دی، تو جدیدیت کے علمبرداروں نے ترقی پسند اہل قلم کی خوبیوں سے چشم پوشی ضروری خیال کی۔ اور مذاہب کی طرح ادب میں بھی فرقہ پرستی کا زہر بو دیا گیا۔ اس سے خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔ قریب سے قریب تر ہونے کی راہ نہ نکل سکی حالانکہ ماضی حال و مستقبل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ان کے ارتباط و تسلسل کا لحاظ مقدم ہے۔ جس نے آگرہ کا تاج محل دیکھا ہے وہ کلکتہ وکٹوریہ میموریل ہال کا نظارہ کر کے یہ کیسے کہہ سکے گا کہ قدیم فن تعمیر کی اچھی نقالی ہے۔ اور

ناظر نظارا ایک ہی جلوے میں گم ہو کر مجذوب کا درجہ تو حاصل کر لے گا۔ اہلِ سلوک کی منزل نہ پا سکے گا۔ آج ہم قدم قدم پر سائنس اور سائنٹفک کی لکھی ہوئی باتیں کر کے مرعوب کرنے کی تو بیدریغ کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ صاحب "آبِ حیات" کا اپنے اُستاد کے ساتھ غلو جس طرح ان کی رائے کے وزن کو ہلکا کر بیٹھا اس طرح ہمارا ایک دائرے میں چکر کاٹنا کل ہمارے وقار کو بھی مجروح کر دے گا۔ مارکسی بر رسی فکر کا طالب علم ہونا یا "سارترے" کی "وجودیت" پر ایمان لے آنا قابلِ اعتراض نہیں۔ البتہ شدت پسندی اور اپنے کو کسی بھی قلعہ میں بند کر کے دوسروں پر خشت باری کرنا بجا نہیں۔ نقاد اپنی کسوٹی تو الگ رکھ سکتا ہے لیکن معدودے چند کو پرکھنا اور باقی کو نظر انداز کر دینا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ جدت اور نوجوانی کے زعم میں اپنے علاقہ کا گن گانے والے جب بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ "ہم نے ولی دکنی کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا آتش و ناسخ کو نہیں پڑھا ہے تو ان کا وقار مستحکم نہیں ہوتا بلکہ یک رُخا پن انھیں ارزاں کر دیتا ہے۔ کارل مارکس نے اپنے سات لکچروں میں سے ایک میں کہا ہے کہ کوئی نظام اپنے ماقبل کے نظام کی مکمل نفی نہیں کرتا ہے۔ (ب) میں الف (ا) کا عنصر ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ قطعی اسی طرح ادب میں بھی ارتباط ہے اگر حالی۔ آزاد اور انقلاب روس نے ترقی پسند تحریک کے لیے راہ ہموار کی تو ترقی پسند تحریک نے "جدیدیت" کو خلق کیا۔ ایک نقاد کے لیے اس رشتے اور لگاؤ کو بخوبی محسوس کرنا واجب ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اس کے لیے جس لگن محنت اور وقت کی ضرورت ہے وہ کہاں نصیب؟ اکثر بیرونی ممالک میں ہوتا یہ ہے کہ نقاد اپنے کو کسی

فن کار دیر کام کرنے کے لیے مخصوص کر دیا کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں اس کے برعکس کوئی ایک موضوع بھی منتخب کرنا کسرِ شان سمجھا جاتا ہے اور ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنا بڑائی تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی نقاد شاعری افسانہ نگاری۔ ناول۔ فلم سنریو وغیرہ وغیرہ پر قلم اٹھانے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ پھر اس کی رائے حرفِ آخر ہو تو کیونکر؟ اچھوں پر اظہارِ رائے کے لیے بیرون کا مطالعہ بھی لازم ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جو سچائی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک کے تمام ناول شعری مجموعے اور افسانے پورے غور و فکر کے ساتھ پڑھے ہیں۔ پھر کیونکر یہ حق حاصل ہو گیا کہ چند گنی چنی تخلیقات کو سب کچھ قرار دے کر یہ حکم لگا دیا جائے کہ بقیہ دریا برد کرنے کے قابل ہیں؟ اس کا رونا تو خوب رویا جاتا ہے کہ اردو میں معیاری ناول کمیاب ہیں لیکن کھلے دل و دماغ سے اس کا اقرار نہیں کیا جاتا کہ جانے پہچانے لوگوں کی کتب اور شناسا اداروں کی مطبوعات تک ہمارا مطالعہ محدود ہے۔ ہم پورے سال بھر کی شائع شدہ تخلیقات بھی پڑھ نہیں پاتے۔ اور جن کو ہمیں خراجِ عقیدت پیش کرنا ہوتا ہے ان کے لیے علمی کس بل پر رائی کا پہاڑ کھڑا دیتے ہیں۔ حقیقتاً ہم ان کاوشوں کو تنقید کی کسوٹی پر نہیں کستے بلکہ تنقید کو کھینچ تان کر ان کی سطح پر لے آتے ہیں اور عظمت کا یقین دلانے کے لیے غلامی سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی کسی مغربی اہلِ قلم کا ہم پلّہ یا مقلد بتا کر سمجھتے ہیں کہ حقِ دوستی ادا کر دیا۔ ادب کوئی مذہب نہیں ہے۔ جہاں آیاتِ قرآنی احادیثِ نبویؐ اور اقوالِ اولیا پیش کر کے ہماری زبانیں بند کر دی جائیں۔ کارلائل کیا کہتا ہے۔؟ ایلیٹ کی کیا رائے ہے؟

خاموش کرنے کے ہتھیار نہیں ہیں۔ نہ موٹے موٹے ناموں کی گردان سے کسی کی علمی صلاحیت کا یقین مستحکم ہوتا ہے۔ دنیا کے لوگ اپنے احول و مذاق کے تحت صدیوں سے بہت سی بولیاں بولتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم ان کے ہمنوا ہو کر کوئی مقام نہیں بنا سکتے ہیں اپنے گرد و پیش کے مدنظر گفتگو واجب ہے۔ کسب نور تو بیجا نہیں لیکن دوسروں کی تجلیوں میں گم ہو کر اپنی روشنی کھو دینا زیبا نہیں۔ تحصیل علم کا مقصد ہے دماغی دریچوں کا وا ہونا۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں تو ہم نے ضرور اپنا ایک مقام بنایا ہے لیکن تنقید کی دنیا میں ہنوز انفرادیت قائم نہیں کی ہے — تعلقات کی گرم بازاری ہے — اور مذاق خود پرستی و خوش فہمی عام ہے۔ نقاد کا وجود اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ کوئی حصار کھینچ لے۔ اسے تو سب کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرنا واجب ہے۔ اسی میں اس کی بڑائی و بلندی ہے۔

دشواری یہ ہے کہ اگر اس طرح کی صاف گوئی کی کوئی ہمت کرتا ہے اور بر بنائے خلوص آئینہ سامنے رکھ دیتا ہے کہ اپنی صورت آپ دیکھ لی جائے تو اس کی آواز دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کا موقع نہیں دیا جاتا ہے کہ اس کے خیالات منظر عام پر آئیں — کاش قلب میں وسعت پیدا کی جائے اور گروپ بندی کا خاتمہ ہو۔

تنقید بڑا کٹھن راستہ ہے۔ آپ اسے پل صراط سے بھی باریک کہہ سکتے ہیں۔ ایک نقاد کو زیب نہیں دیتا کہ کوئی اپنی معاشی پوزیشن کے باعث اگر سماج کے لیے قابل قدر ہو گیا ہے تو وہ بھی آنکھ بند کر کے ایمان لے آئے۔ انقلابی سیاسی فلسفی مذہبی وغیرہ ہونا اور چیز ہے۔ ادیب یا شاعر ہونا اور چیز — اردو زبان نے فن تنقید نے بلاشبہ قابل قدر ترقی کی ہے اور یقینی عظیم نقاد پیدا کیے ہیں۔ لیکن مفروضہ اخلاق کے ہاتھوں حقیقتیں کم بھی

ہو کر رہ گئی ہیں۔ جلسۂ عام میں یا خوشامد و حاضری کے نتیجے میں ایسے لوگوں کو باون گز کا بنا دیا گیا ہے جن کو خود دل و دماغ تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ اندر کچھ اور باہر کچھ مستقل ریاکاری ہے۔ اور نقاد کا دامن اس سے پاک ہونا چاہیئے۔

دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ طلبا جیسا کچھ اپنے اساتذہ سے سنتے ہیں ویسا ہی معلم ہونے کے بعد اپنے طلباء کو بتاتے ہیں۔ مکھی پر مکھی بٹھانا حُسن نہیں۔ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ دوسروں کا فرمانا تو سب بجا۔ لیکن جناب نے اپنے طور پر کیا رائے قائم کی ہے؟ پڑھنے کا مقصد اگر صرف اس قدر رہوتا کہ ہمارے دماغوں میں دوسروں کی کہی ہوئی باتیں گونجتی رہیں تو ہماری حیثیت ٹیپ ریکارڈر سے زیادہ نہ ہوتی۔ لیکن ہماری اسی میں بڑائی پنہاں ہے کہ ہم محض وارث یا مقلد نہیں بلکہ اپنے طور پر بھی غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور حرکت و عمل کی رفتار سُست نہیں ہونے دیتے۔

استاد ہونا اور چیز ہے نقاد ہونا اور چیز۔ یہ اکتسابی ہُنر نہیں ہے بلکہ تمام تر وجدانی ہے اور کچھ ضروری نہیں ہے کہ زبان و ادب کی پرکھ کا مادہ بھی رکھتا ہو اور کسی غیر معلم میں یہ عنصر نہ ملتا ہو شمس الرحمٰن فاروقی کا مشغلہ درس و تدریس نہیں ہے لیکن وہ بلند ترین نقاد ہیں۔ اسی طرح محمد منظر حسین (بہاری) قطعی غیر متعلق انسان ہیں لیکن ان کی پہلی ہی تصنیف "فنون لطیفہ اور جمالیات" "حرف آخر" کا درجہ رکھتی ہے۔ اور نیاز فتح پوری مرحوم کو نگار میں یہ لکھنا پڑا:" اس موضوع پر اتنی مکمل اور جامع کتاب میری نظر سے اب تک نہیں گزری"!

علم کسی کی جاگیر نہیں۔ نہ موٹی سی سند حاصل کرنے کے لیے جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ حقیقی معنوں میں باخبر بناتا ہے۔ اس کے لیے دیدہ ریزی کے ساتھ ساتھ

دل و دماغ کے جالے بھی صاف کرنا پڑتے ہیں۔ علم کی برکت سے انکار کفر ہے اور اس کا اقرار نہ کرنا بھی زیادتی ہے کہ درسی تعلیم آنکھیں کھول دیتی ہے۔ مگر جب تک جذبۂ قبول کی خاطر خواہ صلاحیت نہ ہو اس وقت تک فکر پہ شباب نہیں آتا ہے۔

نقاد کے لیے نڈر اور بہادر ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی اسے جاہل کہتا ہے یا بے خبر تو اسے متاثر نہ ہونا چاہیئے اور دیانتداری سے جو کچھ اس نے سمجھا ہے بیان کر دینا چاہیئے۔ اس وقت اپنے ذہن میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کا ایک دلچسپ فقرہ گونج رہا ہے۔ موصوف نے کسی ملاقات میں فرمایا تھا کہ کچھ لوگ عاقبت بخیر ہونے کے خیال سے لکھتے ہیں۔ عاقبت کا بے خبر ہونا بڑی بھلی بات ہے، خدا سب کی عاقبت بخیر کرے۔ لیکن اس بات کا لحاظ کرنا بھی مقدم ہے کہ کہیں آنکھ بند کر کے چلنا بجائے نجات کے گمراہ نہ کر دے۔ نقاد کے لیے دیدۂ بینا کی شدید ضرورت ہے۔ اس کا مشرب حق گوئی ہے — وہ نہ لگی لپٹی رکھنے کا قائل ہوتا ہے نہ عقیدتاً کسی کے معاملے میں لب کشائی گوارا کرتا ہے۔ وہ کتنے بہت بڑے صوفی تھے یا عاشق رسول۔ اس کو ان باتوں سے کیا سروکار وہ تو ان کے فن کارانہ عمل کا جائزہ لیتا ہے اور اسی اعتبار سے ان کا درجہ متعین کرتا ہے — بعض لوگوں کو اقبال کا شاعر اسلام ہونا۔ اور انیس کا مداح شہدائے کربلا ہونا کچھ اس طرح مرعوب کر بیٹھا ہے کہ وہ ان لوگوں پر گہری نظر ڈالنا گستاخی اور بے ادبی سمجھتے ہیں۔ یہ ہر دو بزرگوار میری نگاہ میں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی بلند ہیں اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اقبال بلاشبہ ایک عظیم صوفی بلند ترین مبلغ چوٹی کے مصلح اور بہت کچھ ہو سکتے تھے لیکن ان کے اندر جو فن کار موجود تھا اس نے باوجود ان کی کوشش کے ان سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کی شاعری بہت سے افکار کی کشید ہے — اور انصاف کا تقاضا ہے کہ

انھیں اپنی عینک سے دیکھا جائے۔

انیس بھی فنکار ہیں — اور اگر وہ مرثیہ خوانی کی طرف مخاطب نہ ہوتے تو جو تغزل اُن کی فطرت میں رچا بسا تھا وہ انھیں بلندیوں سے بلند تر کر سکتا تھا — لیکن حالات تو انسان کو رُخ بدلنے پر مجبور کر ہی دیتے ہیں۔ اور اسے گام گام پر دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے — چنانچہ ان کا خود ارشاد ہے ع

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میر صاحب کو شدت سے اس کا احساس تھا کہ جاگیردارانہ خود پرستی سب کچھ اپنے ہی آئینے میں دیکھنا چاہتی ہے اور وہ اپنے لیے نہیں کہتے تھے بلکہ سامعین کی ضیافتِ طبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔ لہذا اُن کے بس میں یہ نہیں تھا کہ تمام تر اپنے جذبات و احساسات بیان کریں — پان کی لالی۔ مانگ کا صندل۔ انھوں کی مہندی و چوڑیاں "تاش کا جوڑا" سمدھن پر سہرا سندوں کا نیگ، مانگنا وغیرہ وغیرہ جن کی عکاسیں ہیں اور انیس کے کلام میں یہ ہندوستانی تہذیبی عناصر کی رونمائی نہیں ہے بلکہ بورژوائی تہذیب کی بالادستی ہے — کیا صحیح واقعات ہندوستانی تہذیب کے محتاج تھے؟ اور انھیں اودھ کا جامہ پہنائے بغیر تاثر پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ کربلا کا المیہ مشعلِ راہِ انسانیت ہے۔ درس حقانیت اور نیکی و بدی کا تصادم ہے۔ وہ دنیا کی جملہ زبانوں میں تو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ گر اس کا مزاج بدل دیا جائے۔ کسی کی وطن دوستی ثابت کرنے کے لیے یہ کہنا انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ اس نے اپنے تہذیبی عناصر کی بقا کے لیے اس تہذیب کچھ اور ماحول کو گم کر دیا جس کی دین ہمارے سامنے رکھ رہا تھا۔

حادثۂ کربلا نعوذ باللہ کوئی بدیسی جاسوسی ناول نہیں ہے جس کو ہم اپنے قارئین

عبدالحلیم شرر کی یہ ادا کھٹکتی ہے کہ وہ مورّخِ اسلام کہلاتے ہیں۔ تاریخی ناولوں کا انبار لگایا ہے۔ انھوں نے مگر صحیح عہدِ قدیم کی عکاسی نہیں کر پائے ہیں۔ اور "الفریڈ لائل" کی یہ بات درست ثابت ہوگئی ہے کہ تاریخی ناول نگار کو کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی تو پھر اسے کیونکر نظرانداز کر سکتے ہیں کہ مراثی انیس میں خاندانِ نبوت۔ اور بنی ہاشم کا ماحول پس پردہ ہو گیا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور بالخصوص اودھ کے گھرانے کا کوئی موقع دیکھ رہے ہیں۔

کچھ تاریخی حقائق ایسے ہیں جو حرف بحرف ہمارے سامنے آنا چاہیے۔ جنگِ کربلا کا بھی یہی تقاضا ہے۔ کسی کی تصویر میں اپنا رنگ بھرنا خوبی نہیں بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا طائرِ فکر اپنے دائرے تک محدود رہا اور طاقت پرواز نہ دکھا سکا ۔ کمال تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کریں اور نقل اصل کا پرتو ہو جائے جس پر اپنے پیشے کی وجہ سے انیس نے توجہ نہیں دی۔

اگر یہ بات ہمارے نقاد بیان کر دیتے تو قطعی میر صاحب پر آنچ نہ آتی۔ اور ان کی اپنی انصاف پسندی بھی مستحکم ہو جاتی ہے۔ لیکن صرف اس لیے خاموشی اختیار کی گئی کہ عام روش کے برعکس مظاہرہ کریں گے تو ہماری بالغ نظری مشکوک ہو جائے گی اور بات بگڑ جائے گی۔ حالانکہ دنیا میں منصف مزاج لوگ بھی موجود ہیں اور ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ ایک عرصہ تک ادب کو اعلیٰ افراد کا پابند رہنا پڑا ہے۔ زندگی کی گردش محدود رہی ہے۔ وہ محلسرا کے باہر اپنے جلوے نہیں دکھا سکا ہے اور فن کار مجبور رہے ہیں۔ باوجود چاہنے کے بھی وہ اپنے فن کو حقیقت سے قریب نہیں کر سکے ہیں۔ اس لیے بڑی حد تک وہ قابلِ شکایت نہیں ہیں۔ اور تمام تر ذمہ داری اس سماج پر عائد ہوتی ہے جو اس وقت تک برسرِ عروج تھا۔ انیس بھی تمام تر بے گناہ ہیں۔

دل کے پٹ بند ہیں آگہی کیا کریں
گھر میں روزن نہیں روشنی کیا کریں

پروفیسر اعزاز افضل
کلکتہ

KASHMIR UNIVERSITY
Iqbal Library
Acc. No. 258089

اگر آپ

مجھے ناول نگار

نہیں

سمجھتے ہیں تو

میرے ادبی کارناموں

کا

جائزہ لیجیے

شاد عظیم آبادی پر ۔ ایک نظر

قیمت پندرہ روپے

اگر

آپ نے اب تک

میری تصانیف

ادب اور جنس

○

یگانہ چنگیزی حیات و فن

نہیں پڑھی ہیں

تو

اپنی اوّلیں فرصت میں پڑھیے

○

عرفانِ آگہی

پچھلے باب کے اختتامیہ میں میں نے عرض کیا ہے کہ ایک عرصہ تک ادب کو اعلیٰ طبقہ کا پابند رہنا پڑا۔ زندگی کی گردش محدود رہی وہ محلسرا کے باہر اپنے جلوہ نہیں دکھا سکی۔ اور فنکار مجبور رہے باوجود چاہنے کے بھی وہ اپنے فن کو حقیقت سے قریب نہیں کر سکے اس لیے بڑی حد تک وہ قابل شکایت نہیں ہیں اور تمام تر ذمہ داری اس سماج پر عائد ہوتی ہے جو اس وقت برسرِ عروج تھا انیس بھی اسی لیے بے گناہ ہیں۔

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نظیر اکبر آبادی نے قبول عام کی پروا نہ کرتے ہوئے وسیع النظری سے کام لیا۔ اور غالب نے اپنی شاعری کے متعلق یہ سننے کے باوجود کہ ایک چیستان ہے اپنے اندازِ فکر کو تبدیل نہیں کیا اور قاری کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کرنے پر زور نہیں دیا نفسیاتی اعتبار سے شاید وہ لوگ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ آناطولے زبد : نے ایک مقام پر کہا ہے کہ۔

"ادیب و شاعر اپنی تخلیقات میں اپنے تجربات کو کم اور اپنی دبی ہوئی خواہشات کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔ فرائڈ نے اسی روشنی میں زیادہ وضاحت کے ساتھ قاری و فنکار کے انسلاک کو بھی ظاہر کیا ہے اس

کا کہنا ہے کہ قارئین بھی فنکار کی طرح کچھ خواہشات اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں اور جس کے یہاں انھیں آسودگی و تسکین نظر آتی ہے اس کی طرف کھنچ جاتے ہیں اور اسے سر آنکھوں پر جگہ دینے لگتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ جملہ انسان یکساں نہیں ہوتے۔ اپنے ماحول تربیت صحبت اور علم کے نتیجہ میں ان کے یہاں مختلف انداز سے خواہشات پروان چڑھتی ہیں اور ضروری نہیں کہ جو فنکار ایک مزاج کے لوگوں کو متاثر کر سکے یا ان کا پسندیدہ ہو وہی دوسرے مزاج کے لوگوں کو بھی متاثر کر سکے اور ان کا بھی پسندیدہ ہو۔

ہمارے نقاد ناول وغیرہ کے معاملہ میں تو اس کو ملحوظ رکھتے ہیں اور بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ بکثرت بکنے والی تخلیقات سطحی ہوتی ہیں اور عام لوگوں کی آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہیں لہذا قابل ذکر دہی مطبوعات ہیں جو خوش ذوق اور بالغ نگاہ لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مگر یہ کبھی کہنے کی زحمت نہیں فرماتے کہ عام لوگ گریہ وزاری آہ و بکا اور سینہ کوبی ہی کو واقعات کربلا کا ماحصل سمجھتے رہے ہیں اور انیسؔ و دبیرؔ کا بھی نقطۂ نگاہ یہی رہا ہے۔ اس لیے ہر دو فنکار اور ان کے پڑھنے والے اور سننے والوں میں غیر معمولی مماثلت، مطابقت اور قدر مشترک ہے غالبؔ اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ کو اپنے عہد اور محدود دائرۂ حیات سے اس لیے مماثلت نہیں ہے کہ وہ عام روش سے بلند ہیں اور قبل از وقت آگئے تھے میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی عظمت کا منکر نہیں بدرجہ اتم شعری صلاحیت پاتا ہوں انھیں عظیم آرٹسٹ خیال کرتا ہوں۔ اور دیدہ بینا رکھنے والے جو ان کا مطالعہ کرتے ہیں اسے ان کے کمال کا وصف بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر ان حضرات کو رونے والے نہ ملتے تو شاید وہ اپنی سعی کو کامیاب تصور نہ کرتے اور اس منزل پر آکر ان کی اور ان کے قارئین کی خواہشات مساوی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

شاد عظیم آبادی جو یقیناً ان استادانِ فن کے معتقد تھے۔ لیکن مزاج اور افکار کے اعتبار سے علٰحدہ تھے۔ اپنی راہ الگ بنانے میں نہ گھبرائے اور مرثیہ فرماتے ہوئے خیر و شر کے مقابلے میں بڑی صفائی سے کہہ اٹھے ع

دونوں سوار فرد تھے تیغ آزمائی میں

جنگ کا مزہ برابر وار سے ہے اس طرح کردار پر آنچ نہیں آتی بلکہ وہ ابھرتا ہے اور رزمیہ (ایپک) بھی اسی کو کہتے ہیں فنکار تخلیق فن کرتے ہوئے اعتقاد سے بالاتر ہوجاتا ہے۔ وہ دوسروں کی خواہشات کے مطابق عمل نہیں کرتا اور اپنے معیار کے مطابق دبی ہوتی خواہشات کو بروئے کار لاتا ہے مرنے والوں پر رونا معیوب نہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ جب دل پر چوٹ پڑتی ہے تو آنسو ہی نکل آتے ہیں مگر ساتھ ساتھ یہ بھی سچائی ہے کہ رونے سے جی ہلکا ہوجاتا ہے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور وہ اعلیٰ مقصد گم ہوجاتا ہے جو معراج انسانیت ہے مراثی کے تو معنی ہی ہیں اظہار حزن و ملال کے اور اس کا بھی کوئی منصف مزاج منکر نہیں ہوسکتا کہ میدان کربلا میں بنی ہاشم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ان کا ذکر قطعی ہونا چاہیے لیکن یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان کی مجبوری و بے بسی بہ جبر نہ تھیں وہ خشک و تر پر قدرت رکھتے تھے اور ہوا کا رخ بدل دے سکتے تھے مگر امتحان گاہ عشق میں کامیاب ہونے کے لیے انھوں نے ایسا نہیں کیا اور خواجہ معین الدین چشتی نے اسی خصوصیت کو محسوس کرتے ہوئے خراج عقیدت یوں پیش کیا ع

واللہ کہ اے حسینؑ کار کر دی

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر قلب حسّاس ہے تو شخص ایک مصرعہ پر آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ سکتا ہے آپ اسے فرزند رسولؐ کی کامیابی پر خوشی کے آنسو کہیں یا ان کی شہادت پر غم کے اشک قرار دیں لیکن یہ بات اٹل ہے کہ کہنے والے

کا مقصد آپ کو رلانا نہیں ہے اس نے تو بے اختیار کردار حسینؑ سے متاثر ہو کر ایک نعرہ لگایا ہے۔

لیکن آج تک نہ ہمارے نقاد انیس کے مقابلہ میں اس اضطراری عمل کا ذکر خیر کرنے پر آمادہ ہوئے نہ شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری پر توجہ دینے کے لیے تیار ہوئے ہیں یہ بے ادبی کبھی نہ کروں گا کہ انیس و دبیر کے قارئین و سامعین کی خواہشات اور ان دونوں بزرگوں کی اپنی خواہشات کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک ہی عینک سے دیکھوں لیکن اس کا اعتراف کرنے سے بھی باز نہیں آؤں گا کہ وہ حضرات ذاکر بھی تھے انھیں اپنے اس منصب کا بھی قدم قدم پر لحاظ کرنا پڑ رہا تھا اور نہ وہ قاری کی سطح پر آ کر اپنے جوہر نہ دکھاتے بلکہ قاری کو اپنی سطح پر لا کر لعل و گہر لٹاتے جو لوگ اس طرح سے پابند نہیں تھے اور اپنے شوق کی خاطر ارشاد گرامی بر سر منبر پیش کرتے تھے ان کو نظر انداز کرنا ترقی یافتہ دور کے نقاد کو زیب نہیں دیتا۔

وہ حضرات جو شعر و ادب کے نقاد ہونے کے دعویدار ہیں اور کسی ایک صنف کا بخوبی جائزہ لینے والا اپنے کو کہتے ہیں ان کا اخلاقی فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ حتی الامکان اس میدان کے کسی شہ سوار کو نظر انداز نہ کریں اگر انیس و دبیر کو تاجداران سخن ہی کہنا ہے اور اس خیال پر سختی سے قائم رہنا ہے کہ عمل ارتقاء بے معنی ہے سلسلہ تخلیق یکساں نہیں رہ سکتا اور ایک سے ایک کا پیدا ہونا محال ہے تب بھی اس پر تو توجہ دینی چاہیے کہ ہم عقیدہ ہونے کے باعث بکثرت لکھتے رہنا اور شائع کرانا نہ زبان و ادب کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ محض طلب شہرت اور جلب منفعت کے لیے رائی کا پربت بنانا کچھ مراثی کو غیر مطبوعہ قرار دے کر پیش کرنا صحت کے ساتھ نذر کرنے کا ڈھنڈورا پیٹنا اور یہ بتانا کہ یہ نامکمل ہے اس میں اتنے بند تھے اس کا مطلع یہ ہے وغیرہ وغیرہ کون سا مفید کام ہے۔ انیس و دبیر کی حیثیت تو مسلم ہے اور جن لوگوں کو ان پر ریسرچ

کا شوق ہے انھیں یوپی تک اپنا دائرہ محدود رکھنا بھی زیب نہیں دیتا چونکہ پرنس بابر کے ذاتی کتب خانے عظیم آباد کے پرانے گھرانے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے دامن میں بہت کچھ صحیح مواد موجود ہے ان سے بھی فیضیاب ہونا چاہیئے۔ پھر مرحوم پروفیسر مسعود حسن صاحب بھی کافی کام کر چکے ہیں اور ضرورت اس کی ہے کہ انھوں نے جو باغ لگایا تھا اس میں کیسے کیسے گل بوٹے کھلے ہیں۔ اور عہد حاضر میں مراثی نے کون سا رخ اختیار کیا ہے اس پر خامہ فرسائی فرمائی جاتی تو گراں قدر اضافہ بھی ہوتا لیکن یہ کام کوئی آسان تو ہے نہیں مستقل محنت چاہتا ہے۔ اور محنت کرنے کا شوق کس میں ہے۔ آسانی سے جس کے سلسلہ میں بہت کچھ دستیاب ہوتا ہے۔ اسے توڑ مروڑ کر اپنے نام سے شائع کرا دیا جاتا ہے پھر صوبائی تعصب کی برف بھی ابھی پگھلی نہیں ہے اتنی فرصت کہاں ہے کسی کو کہ جناب شاد عظیم آبادی کے مراثی کا غائر نظر سے مطالعہ کرے۔ رشید اعظیم آبادی کے نوحے اور سلام تلاش کرے اور علامہ جمیل مظہری کی اس نوع کی تخلیقات کا گہرائی سے جائزہ لے۔

اصول تنقید پر مضامین اور کتب کی کمی نہیں ہے ہماری زبان کے اہل قلم انبار لگا رہے ہیں لیکن اختراع اور ایجاد کا کہیں کوئی ہلکا سا جلوہ بھی نظر نہیں آتا خاطراً یا حتراماً ان کاوش کو ترجمہ نہ بھی کہا جائے تو بھی دل یہ ضرور کہتا ہے کہ اپنا کچھ نہیں ہے سب کچھ دوسروں کی کارفرمائی ہے شاید ابتدا میں اس طرف توجہ نہ ہوتی اور یہ سمجھ کر ٹال دیا جاتا کہ مغربی علوم و فنون کی چھاپ فوری طور پر کیسے مٹادی جاسکتی لیکن بات اب نہیں رہی ہے چونکہ ہم میں تعلیم کو قبول کر کے نکھرنے و سنورنے کا جذبہ کسی قدر ہی سہی بحمد اللہ پیدا ضرور ہو گیا ہے۔

بلاشبہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو سوچ سمجھ کر مطالعہ کرتے ہیں اگر وہ حقیقتاً ذہنی طور پر بھی آزاد ہو چکے ہوتے تو اس کا امکان قوی تھا کہ اپنے طور پر کوئی راہ دکھاتے

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مادی تنقید قابل اعتراض ہے یا تحلیل نفسی سب کچھ ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ کوئی مدرسہ فکر ہو اس کی آنکھ بند کر کے تقلید کرنا حق نہیں اور کچھ لوگوں کو ہمیشہ پوجتے رہنا دیدہ وری کی پہچان نہیں۔ اس طرح ایک کٹر پن اور عصبیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے ہمارے لیے یہ دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ کب اور کہاں کیا حالات تھے۔ اور فن کے سلسلے میں جو اصول اور قواعد وضوابط تشکیل دیئے گئے ہیں وہ کس حد تک ہمارے عہد اور ماحول پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اعتدال اور توازن پیدا ہوتا ہے بلکہ اپنے یک رخے پن کی بدولت جو دائرہ تنگ ہے اس میں وسعت بھی آتی ہے۔

مختلف انداز فکر سے کام لینا اور کسی ایک حصار میں اپنے کو بند نہ کرنا کوئی بری چیز نہیں ہے علم وادب کا دامن بڑا کشادہ ہے اور جو نقاد اپنی وسیع النظری اور روشن دماغی سے کام لیتے ہیں ان کا عمل بھی ارفع واعلیٰ ہوتا ہے اور مرتبہ بھی بلندیوں سے بلند تر سچے نقاد کے لیے یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ کس فن پارے کی تخلیق کے محرکات کیا ہیں سب کو ایک کسوٹی پر پرکھنا بجا نہ ہوگا جب تک تحریک و محرکات کا سراغ نہیں لگایا جائے گا کوئی فن پارہ اپنی تہیں نہیں کھولے گا محض یہ خیال کر لینا کہ عہد اور ماحول کی سب کچھ برکت ہے۔ لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشات جو تمام تر جنسی ہوتی ہیں ادب کے پیکر میں میں سامنے آئی ہیں۔ کافی نہیں ہیں بسا اوقات فن کی تخلیق کے اسباب اور بھی ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کے معقول اور ابھرتے ہوئے نقاد سلیم احمد نے بتایا ہے کہ۔

> "میرے سامنے بنیادی سوال ایک ہے اقبال کے باطن میں اقبال کی شاعری کا سرچشمہ کہاں ہے وہ کون سا مرکزی مسئلہ ہے جس سے ان کے وجود میں طوفان یا زلزلہ پیدا ہوتا ہے جو ان کی شاعری کی بنیاد ہے؟"

اسی سلسلہ میں موصوف آگے چل کر واضح کرتے ہیں کہ:

"اقبال کا مرکزی مسئلہ نہ خودی ہے نہ عشق نہ عمل نہ قوت و حرکت بلکہ ان سب کے برعکس موت ہے":

اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

اب ذرا سوچیے کہ ایک مخصوص عینک لگا کر ان کو نگاہ تنقید سے دیکھنے والا کیا پا سکتا ہے اسی طرح کا معاملہ دوسروں کا بھی ہے لہذا نقاد کو تو تمام تر آزاد ہونا لازم ہے اور فن سے صحیح آشنائی کے لیے جس راہ سے بھی اسے پہچاننا آسان ہو اسے بغیر جھجھک قبول کرنا چاہیے۔ اور اس کی پرواہ بالکل نہ کرنی چاہئے کہ کہنے والے اسے فرائیڈین نقاد نہیں کہہ رہے ہیں یا مارکسی تنقید نگار کا نام نہیں دے رہے ہیں نام کی حقیقت کچھ نہیں ہے کام کی ضرور اہمیت ہے اور کام اپنے کو محدود کرنے سے نہیں ہوا کرتا بلکہ وسیع سے وسیع تر کرنے سے ممکن ہے یہ وسعت کسی کو گمراہ نہیں ثابت کرتی نہ یہ بتاتی ہے کہ اس نقاد کا کوئی عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایک قسم کی عینک آنکھوں پر نہیں چڑھی ہوئی ہے اسی لیے اس کا فیصلہ مخلصانہ و دیانتدارانہ ہوگا نقاد کے لیے زیادہ سے زیادہ علوم و فنون جاننے کی بات کیوں کی جاتی ہے اسی لیے تو کہ بصیرت میں اضافہ ہو محدود نہ رہے اور آسانی سے ہر قسم کے ارباب فن کے قلب کی گہرائی میں اتر سکے مولوی عبدالحق صاحب کا فرمانا ہے۔

"تنقید پر صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع مطالعہ گہرا اور نظر دور بین ہو۔ جو نہ صرف ذوق صحیح رکھتا ہو بلکہ دنیا کے ادبیات کا شناور بھی ہو جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے

قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور دوسروں کے دلنشیں کر سکے۔"

ڈاکٹر اختر اورنیوی مرحوم نے تنقید پر اظہار خیال فرماتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ کامیاب اور قیمتی فن پارہ وہ ہے جو حسن و اثر کے معیار پر پورا اترے۔

جہاں تک اثر کا معاملہ ہے وہاں تک صحافی بھی پیچھے نہیں ہیں وہ فکاہیہ یا اداریہ اسی انداز پر لکھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ متاثر ہوں اور ان کے نقطۂ نگاہ سے متفق ہو جائیں۔ لیکن شعر و ادب کی دنیا میں نوعیت کچھ اور ہوتی ہے اور وہی فن پارہ عمر دوام حاصل کرتا ہے۔ جس کا اثر تغیر زمان و مکان کے باوجود قائم و دائم رہتا ہے چنانچہ آرٹ کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ جس طرح آرٹسٹ نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسی طرح دوسروں کو محسوس کرنے اور اثر لینے پر تیار کر دے۔ یہ منزل رشد و ہدایت سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔ نہ کوئی نظریہ قبول کرنے سے سیر ہوتی ہے چونکہ اس کا گہرا تعلق دل سے ہے اور جب تک دل میں کوئی تیر پیوست نہ ہو اس وقت آہ میں اثر نہیں پیدا ہو سکتا اس کا امکان تو قوی ہے کہ حقیقتاً کسی مدرسہ فکر کی گہری چھاپ پڑی ہو اور فنکار غیر ارادی طور پر اس کے اظہار کے لیے مجبور ہو۔ لیکن یہ بھی قطعی ممکن ہے کہ قبول عام کی خاطر اس نے کوئی راستہ اپنے لیے منتخب کیا ہو اور ریاض اور مشق کی برکت سے اس پر چل کھڑا ہوا ہو تو نقاد کو ایسے موقعہ پر خط امتیاز کھینچنے کے لیے تاثر کو گہرائی سے محسوس کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ واقعی کس کے یہاں وقتی و ڈرامائی انداز میں یہ کارفرما ہے۔ اسی کے ماتحت سچے اور غیر سچے فنکار کی قدر و قیمت مقرر کرنا ہوگی۔

مثلاً ترقی پسند کہلانے کے شوق میں بہت سے لوگوں نے نعرہ انقلاب بلند کیا لیکن فیض۔ مخدوم۔ جعفری۔ کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کی صف میں وہ نہ کھڑے

ہو سکے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ اول الذکر حضرت کا تاثر حقیقی تھا اور آخر الذکر حضرات کا مصنوعی و ان فیشن۔ سوال یہ نہیں ہے کہ فنکار اپنے فن پاروں میں کس طرح کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ گرد و پیش سے متاثر نہ ہو اور صرف اپنی رومانی دنیا کا اسیر ہو جو سچائی کے ساتھ اس نے اثر قبول کیا ہے وہ اجاگر کر رہا ہے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ سماجی تقاضوں سے منحرف ہے اس کے تاثر کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ قطعی اس کے اثر کی عظمت کا اقرار کریں گے اور ہمیشہ اس طرح کے فن پارے یاد رکھیں گے۔

دور بہت کیوں بھاگو ہو کیا سیکھا طرز غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

کچھ ایسی ہی صورت حسن کی بھی ہے قدریں بدلتی رہتی ہیں زمانہ ایک حال پر نہیں رہتا ہے اور عہد حاضر میں ہم حسن کے لیے بھی پیمانہ بنانے لگے ہیں لیکن باوجود ناپ تول کے کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جن پر زمان و مکان اثر انداز نہیں ہوتے اور اسی بیرونی و قدیم شہ پاروں کے حسن پر دیدہ و دل وار نے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں اور ہوتے رہیں گے نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی وسعت نظری کو راہ دے اور قدیم و جدید نئے پرانے الغرض ہر قسم کے فن میں اس کی تلاش کرے اور غیر جانبدارانہ انداز سے کوئی حکم لگائے۔

سید احتشام حسین صاحب رضوی مرحوم تنقید اور نقاد کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"تنقید کی صلاحیت براہ راست اس عام شعور کا ایک عکس ہوتی ہے جو سماج میں پیدا ہو جاتا ہے اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے کہ تنقید کو تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی

جائے اور اس کے اصولوں کو اس طرح ترتیب کیا جائے جس کی
مدد سے زیادہ سے زیادہ انسان ادب لطیف سے لطف اندوز
ہو سکیں اور انسانی مفاد کے کام میں بھی لا سکیں؟

پروفیسر احتشام صاحب میرے دیرینہ کرم فرماؤں میں تھے۔ وہ انتہائی سنجیدہ متوازن شریف اور دیانتدار انسان تھے ان میں خود تنقیدی کا مادہ بھی تھا وہ شعر بھی کہتے تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا میلان طبع نقد و نظر کی طرف ہے چنانچہ اسی پر زور دیا اور اسی حیثیت سے اپنے کو پیش بھی کیا۔ بیک وقت وہ سب کچھ بن کر منظر عام پہ نہ آئے اور صرف نقاد کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ بہر رنگ وہ نمودار ہوتے تب بھی ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ چونکہ وہ اپنے برتاؤ اور اخلاق سے اتنے ہر دلعزیز تھے کہ کسی کو بھی انھیں تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوتا لیکن یہ ان کی بڑائی تھی کہ ان کی طبیعت جس طرف چلتی تھی اسی طرف انھوں نے دعوت توجہ دی اور لوگوں کو مخاطب کیا۔ حالانکہ اس میدان میں ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے بہت پیدا ہو گئے اور مروتاً ان کو ایسے لوگوں پر بھی لکھنا پڑا جو ان کے معیار پر نہیں اترتے تھے شرافت کی جس بلندی پر فائز تھے وہ اس کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ میدان نقد میں ایسے اصولوں کو ترتیب دیئے جانے کی حمایت کریں جس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ انسان ادب لطیف سے لطف اندوز ہو سکیں اس کی حقیقت کو بھی سمجھ سکیں اور اسے انسانی مفاد کے کام میں بھی لا سکیں

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ادب لطیف کو انسانی کے کام میں لانا بھی ضروری ہے؟ یہ مادی تنقید کا ایک پہلو اور مارکسی نقاد کا اعتقاد تو بیشک اصول ہے اور وہ فن پاروں میں اس کی تلاش بھی کرتا ہے۔ ڈھونڈ بھی نکالتا ہے۔ اور ثابت بھی کر دیتا ہے پھر بھی بہت سے دلوں میں ایک کھٹک سی باقی رہ جاتی ہے۔

مثلاً غالب کا شعر ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اپنے زورِ قلم سے اس کے معنی و مطالب بہت کچھ تحریر کئے جا سکتے ہیں انسانی مفاد کے پہلو بھی نکالے جا سکتے ہیں اور شاعر کو فلسفی و حکیم بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کیا پورے اعتماد و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں بھی یہی باتیں تھیں جو ہم بیان کر رہے ہیں کسی نظریہ کی سختی سے پابندی صحیح عرفان و آگہی سے کوسوں دور کر دیتی ہے اور اپنے مدرسۂ فکر سے وفاداری کا تقاضہ ہوتا ہے کہ ہر موقع پر اس کی عظمت و صداقت مترشح کی جائے اور فنکار کو سمجھنے سے زیادہ اس پر نگاہ رہے کہ جو ہماری کسوٹی ہے وہ کہیں پر ہمت نہ ہارے انقلاب روس سے پہلے نہ ہمارے ادیب و شاعر مجموعی حیثیت سے اشتراکیت سے کوئی دلچسپی لے رہے تھے۔ نہ سب کے سب سیاسی مزاج رکھتے تھے نہ کسی کے سامنے مفاد عامہ کا خیال تھا لہٰذا ایک نقاد کو حقائق سے روگردانی کرنا بھی زیبا نہیں ہے اور محض اس وجہ سے کہ کوئی فن کار ہم خیال نہیں ہے رد کرنا یا قابل اعتنا سمجھنا مناسب ہے؟ اس کا تو یہ فرض ہے کہ جو جیسا کچھ ہے دیانتداری سے بتادے اور جو کچھ جس کے یہاں خوبیاں یا خامیاں اس کو نظر آتی ہیں ان کو سب کے سامنے رکھ دے۔

سیاست کی گرم بازاری نے اپنے مفاد کے لیے ادب و تنقید کو بھی نہیں بخشا ہے مختلف زبانوں میں لٹریچر عام کر کے ذہن کو خاصہ متاثر کیا گیا ہے بے جادہ چلنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ ہندوستان مہاتما گاندھی کی قیادت میں نعرہ انقلاب لگا رہا تھا۔ اور بغاوت کے گیت گانا اسے بھلا معلوم ہو رہا تھا مولانا حالی اور ان کا گروپ تو مقصدی ادب کے لیے زمین ہموار کر ہی گئے تھے سیاسی لوگوں کو کچھ زیادہ

زحمت گوارانہ کرنا پڑی اور ہمارے پڑھے لکھے لوگ روس کی تتبع میں تیزی سے نئی راہ پر چلنے لگے ادب کی پرکھ کا مزاج بدلا اور مقیاس و معیار کی نوعیت بھی تبدیل ہوئی۔ یہ تغیر خلاف فطرت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر اختر اورنیوی مرحوم نے تحریر کیا ہے:۔

"ادب میں معیار قائم ہوتے ہیں اور ان کی پیروی کی جاتی ہے اور گاہے گاہے معیار میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ معیار کی تبدیلی زمانے کے رجحانات یا کسی نابغہ (GENIUS) کی شدید انفرادیت کی رہین منت ہوتی ہے نابغہ ماحول اور زمانے کی پیداوار ہوتا ہے اور زمانے کا ردعمل اول الذکر اپنے زمانے کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اور آخر الذکر خالق ماحول و پروردگار زمانہ وہ ایک انقلاب پیدا کرتا ہے۔"

نقاد بھی نابغہ (GENIUS) ہوتا ہے اس کا کام محض مقررہ معیار کی پیروی ہی نہیں ہے بلکہ اپنے تجربے علم و مشاہدے کی برکت سے ضرورتاً تبدیلی لانا بھی ہے بصیرت سے مراد ہی یہ ہے کہ بنے بنائے نقوش پر چلنا کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اپنی ذہنی قوت سے اگر بنی بنائی راہ میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم اضافہ کے لیے روشن اشارے کر دیئے جائیں تاکہ آئندہ نسلیں اپنی صلاحیت اور جرأت سے کام لے سکیں۔ اب تک تنقید کی جو راہیں واضح ہوئیں ہیں وہ تاریخی اعتبار سے بھی اس کی غمازی کر رہی ہیں کہ کاروان غور و فکر جمود کا عادی نہیں حرکت و عمل اس کی فطرت میں داخل ہے اور آگے بڑھنا بخوبی جانتا ہے۔ کچھ لوگ ہمیں ضرور ایسے نظر آتے ہیں جو ارتقائی عمل کی طرف متوجہ ہیں۔ اسلوب احمد انصاری۔ سلیم احمد اور شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے منظر اعظمی وغیرہ وغیرہ۔ یہ

بلاشبہ فال نیک ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ علی احمد جلیلی کی طرح کے لوگ بھی پرانی ڈگر سے چمٹے ہوئے گزشتہ مسند نشینوں کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہے ہیں۔ ادب و تنقید میں یہ تضاد کوئی انوکھا نہیں ہے۔ سیاہ و سفید میں ٹکراؤ ہوتا رہا ہے۔ اور اسی ٹکراؤ سے تجربات میں وسعت آئی ہے۔ اور "آب حیات" کے مقابلہ میں تنقید کیا ہے۔ اردو شاعری پر ایک نظر۔ روایت و بغاوت الغرض معرکۃ الآرا تصانیف سامنے آئیں ہیں۔ اور آ رہی ہیں۔ لیکن مخدوش کرنے والا انداز یہ ہے کہ اکثریت ایک خاص مقام تک پہونچ کر رک گئی ہے اور مجموعی طور پر تنقیدی کاوش میں کوئی نیا پن نہیں دکھائی دیتا۔ سیاسی و سماجی مصلحتوں کے پیش نظر فن کاروں کی صدی منانے کا رواج ہوا تو جس کو دیکھئے نیچے جھاڑ کر لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ لکھنا بڑی بھلی بات ہے زیادہ سے زیادہ کسی پر لکھا جائے تو برا کیا ہے۔ مگر دشواری تو یہ ہے کہ سب ایک ہی بات دہرا رہے ہیں۔ غالب اور اقبال کی انفرادیت مستحکم لیکن انسان تو متنوع اور مختلف المزاج ہے۔ اس کے تنوع کی جھلک نہ دکھائی دینا اور سب کی لیے ایک ہی مرکز پر لوٹنا تنقید اور محنت سے جی چرانے کی علامت ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مضحکہ انگیز بھی ہے کوئی کتنا عظیم فن کار کیوں نہ ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ انسان بھی ہوتا ہے وہی انسان جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خطا و نسیان سے مرکب ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کسی کو روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو دکھائی ہی نہیں دیا؟

اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے نقاد یا تو خود کسی کو غور سے نہیں پڑھتے یا کچھ لوگ کسی کو فرشتہ قرار دیتے ہیں تو سب کے سب تائید کرنے اور ہاں ہاں میں ملانے پر تیار ہو جاتے ہیں اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گروپ بندی ہے اور جرأت و اخلاق کا فقدان۔

کم از کم اس ترقی یافتہ دور میں اس بات کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ محقق و نقاد کی الگ الگ حیثیت ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب جو ایک مستند اور چوٹی کے محقق ہیں مجھے ان کی خدمت میں کافی عرصہ تک باریاب ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ وہ میرے محسن بھی ہیں اور میں ان کے احسانات کو کبھی نہ بھول سکوں گا ان کو میں نے یہ دیکھا کہ قریب سے قریب تر لوگ دیباچہ پیش لفظ یا مقدمہ لکھنے کی ان سے استدعا کرتے تھے لیکن وہ حتی الامکان دامن بچاتے تھے ممکن ہے اس میں کچھ اور مصلحت ہو۔ لیکن جہاں تک میں نے سمجھا ہے وہ اس مقولہ پر کاربند رہے ہے۔ "یک در گیر و محکم گیر"۔ انسان اپنی مختصر عمر میں اگر کسی ایک ہی میدان میں کوئی جگہ بنالے تو بڑی بات ہے۔ ہر طرف ہاتھ پیر چلانا انگریزی کی اس کہاوت کو صحیح ثابت کرتا ہے کہ :۔

"سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرنے والے معلم ناواقفیت ہوتے ہیں"

نقاد کے فرائض میں یہ داخل نہیں ہے کہ وہ اسے منکشف کرے کہ میر کا مذہب کیا تھا وہ کہاں پیدا ہوئے مختلف قلمی نسخوں میں ان کے بارے میں اختلاف ہے انیس کے کون کون سے مراثی غیر مطبوعہ ہیں انھوں نے کب کیا کہا اور ان کے نام سے جو سلام منسوب ہے یہ ان کا ہے یا نہیں۔ یہ کام تحقیق کرنے والے کا ہے اور دوسرے کے معاملات میں دخل دینا کوئی بھلی بات نہیں ہے۔ جس کی طبیعت جس طرف مخاطب ہے اس کو اس طرف آزادی سے جانے دینا چاہیئے اور خواہ مخواہ شہرت کے لیے دوسرے کے آڑے آنا اور ہر رنگ میں اپنے کو پیش کرنا پسندیدہ نہیں۔

تنقیدی فرائض انجام دینے کی منزل الگ ہوتی ہے یہ تو ممکن ہے کہ ضمنی

طور پر اپنی واقفیت کے ماتحت وہ کسی کے بارے میں یہ بھی بتا دیں کہ وہ کہاں پیدا ہوا کس سنہ میں پیدا ہوا کیا ماحول تھا اس کا۔ لیکن ایک محقق کے طور پر کسی دعوی کے ساتھ نہیں بلکہ میدان نقد و نظر میں ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اور یہ محسوس کرانے کے لیے کہ اس کی شخصیت کی تشکیل کا پس منظر کیا تھا۔ اور اس کے رشحات قلم پر وہ کہاں تک اثر انداز ہے نقاد فنکار کے فن سے بحث کرتا ہے اس کے حالات زندگی سے نہیں۔ اس کا مقصود فنکارانہ عمل کی نقاب کشائی ہے کسی کی تفصیلی حیات کی پردہ دری نہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ہر دو انداز فکر کو گڈمڈ نہ کرنا چاہیے ہو سکتا ہے کسی میں بیک وقت بہت سی صلاحیتیں مجتمع ہو گئیں ہوں لیکن ان کی حیثیت کلیہ کی نہیں مستثنیات کی ہے۔ اور مستثنیات پر نہیں حکم لگایا جاتا ہے۔ بلکہ کلیہ پر کبھی کبھی دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ بہت دیر میں آنکھ کھلتی ہے لیکن جہاں سے جاگے وہیں سے سویرا۔ پچھلی زندگی کی غفلتوں پر کف افسوس ملنے سے زیادہ بہتر ہے کہ جو موقعہ ہے اس میں اپنا من پسند کام کر لیا جائے بسیار نویسی کوئی خوبی نہیں۔ نہ بیٹھ کر کثیر تصانیف کا بوجھ لادے لادے پھرنا بڑائی کی دلیل ہے کتاب عمر میں ایک ہی لکھی جاتی ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو سجدۂ شکر ادا کرنا چاہیے۔

یہ دنیا مستقل تجربہ گاہ ہے گام گام پر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اب تک اپنے کو تاریکی میں خیال کر کے روشنی کی طرف بڑھ جانا نہ تلون مزاجی ہے نہ کوئی سبکی کی بات بلکہ کھلا دل و دماغ رکھنے کی علامت ہے۔ اور نقاد سے ہم کھلے دل و دماغ ہی کی توقع کرتے ہیں وہ ہر لمحہ غور و فکر کیا کرتا ہے اور جب بھی اسے دُرِ نایاب مل جاتا ہے تو وہ ان کی چمک دمک دکھانے سے باز نہیں آتا یہی وجہ ہے کہ میرا عقیدہ ہے۔ پڑھیئے زیادہ لکھیئے کم۔ اس میں

کوئی توہین اور کمزوری کی بات نہیں ہے۔ اگر ہم اس کا اعتراف کرلیں کہ مختلف اصناف ادب پر ہماری نظر نہیں ہے اور ہم ان کے بارے میں کچھ کہنے کے مجاز نہیں ہیں نقاد کا کسی ایک صنف میں کامیاب تنقیدی قوت رکھنا ہی بہت ہی بڑی بات ہے اس کو اپنی بڑائی مجروح نہ کرنی چاہیے اور چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔

یہ بات دل لگتی ہے کہ کثیر پیداوار میں کسی ایک جنس کو جانچنا فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے۔ جس شدت سے ناول لکھے جارہے ہیں وہ اس کے متقاضی ہیں کہ چند لوگ ان کا جائزہ لینا ضروری سمجھیں اور کسی ایک شخص پر تمام بوجھ نہ ڈال دیں بغیر اس کے منصفانہ اور مدلّل کام ہو بھی نہیں سکتا ہے اور کام ہونا اس لیے ضروری ہے کہ آج انتہائی مقبول صنف یہی ہے چھوٹے بڑے مرد عورت کم پڑھے لکھے اور زیادہ پڑھے لکھے الغرض سب کے سب کسی نہ کسی اعتبار سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بکثرت حضرات کو ادب سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس پر تنقیدی نظر ڈالنا بہر اعتبار واجب ہے۔

سائنسی عہد میں نقاد کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں تنقید اب محض مشغلہ نہیں رہا ہے۔ بلکہ صحت مند معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں اس کا نمایاں اور بہت بڑا ہاتھ ہے اکثر و بیشتر لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ زبان کو کارآمد بنانے کے لیے اقتصادیات عمرانیات اور نفسیات وغیرہ پر لکھنے کی ضرورت ہے شعر و ادب اور تنقید و تحقیق پر کب تک کام ہوتا رہے گا تو ایسا نہیں ہے کہ ہماری زبان کا سرمایہ محض ادب ہی تک محدود ہے۔ مختلف موضوعات پر بھی لکھا گیا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ لیکن تنقیدی ادب سب کو احاطہ کیے ہوئے ہے اور یہ ایک ایسا دریا ہے جس میں جملہ لہریں رواں دواں ہیں۔

ادب کا دائرہ اب محدود نہیں رہا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کسی وقت بھی محدود نہ تھا اس کی آغوش فلسفۂ الٰہیات۔ منطق۔ سائنس۔ سماجیات اور نفسیات سب کو سموئے ہوئے ہے یہ تنقید ہی کی برکت ہے کہ پوشیدہ خزانوں کو نمایاں ہونے کا موقع ملا ہے نقاد نے ان پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ اور بلا شبہ اس قابل بنا دیا ہے کہ شعر ادب یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کیا ہے جو ہمارے دامن میں نہیں ہے۔

اب توجہ طلب امر یہ ہے کہ جو محیط کل ہو اس کے پرکھنے والے اگر اپنا جائزہ آپ نہ لیں تو کیا یہ ظلم و ستم نہیں ہے؟ انفرادی و شخصی گفتگو اچھی چیز نہیں۔ بیں زیادہ تر اس سے گریز کرنا چاہتا ہوں چونکہ جو لوگ بزعم خود خدائے نقد و نظر بنے ہوئے ہیں اور شہرت کے طلبگاروں کا ایک اچھا خاصہ مجمع ان کے ارد گرد ہے وہ بڑے نازک طبع ہیں ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے ہیں۔ اور سوچنے لگتے ہیں کہ بھلا ہم کو کوئی نیک مشورہ دے؟ ہم تو حرف آخر ہیں ہمارے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ آیات ربانی سے کم نہیں ہے اس لیے مجموعی طور پر گزارش کروں گا کہ بات اپنی نظر اور پسند کی نہیں رہی ہے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہو سکتا ہے کہ:

> "شرر اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام رکھتے ہیں وہ ایک طرح سے اردو ناول کے موجد ہیں جنھوں نے انگریزی ناولوں کی تقلید میں ناول نگاری شروع کی۔

مسٹر سہیل بخاری کی یہ رائے کتنی ہی بجا کیوں نہ ہو اور ڈاکٹر عبد اللطیف کا کہنا بھی سو فیصدی درست ہو کہ:

> "وہ نذیر احمد کے مقابلہ میں انگریزی ادب اور انگریزوں کی زندگی سے زیادہ واقف تھے اس لیے پلاٹ بنانے کے راز سے بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف تھے۔

پھر بھی اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا کہ تعلقات و احترام میں انھیں تاریخ اردو ادب میں فراموش نہیں کیا گیا۔ ورنہ الفریڈ لائل کی یہ رائے بڑی مستحکم ہے کہ:

"تاریخی ناول نگار کو کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ قیاس مشاہدہ کی جگہ نہیں لے سکتا اور تاریخی ناول نگار اپنی عمارت قیاس ہی پر کھڑی کرتا ہے۔"

مولانا شرر کے اکثر ناول ایسے ہیں کہ کرداروں کا نام بدل کر ایک دوسرے میں بآسانی فٹ ہو جاتے ہیں۔ منصور موہنا حسن انجیلنا وغیرہ کی یہی صورت حال ہے۔ منظر نگاری بھی ان کی محدود ہے۔ عرب کے ریگستانوں کا جو وہ نقشہ کھینچتے ہیں وہ واضح نہیں ہوتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ تصورات پر محل کھڑا کیا جا رہا ہے۔ پلاٹ بنانے میں کسی جدت کا وہ ثبوت نہیں دیتے ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انھوں نے عام مسلمانوں کی آسودگی کا سامان فراہم کیا اور تاریخی حقائق اجاگر کرنے کا نام لے کر قاری کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کیا ہے آدمی رسا تھے سماجی پوزیشن رکھتے تھے یوپی اور خصوصیت سے لکھنؤ والے تھے اچھے اچھے لوگوں سے ملاقات تھی اور آسانی سے تاریخ ادب اردو میں ایک جگہ پا گئے۔

جناب احتشام حسین رضوی مرحوم کا ارشاد گرامی ہے:

"بہت سے نقاد نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے لیکن محض اصلاح کا چکر ہے۔ میں ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر انھیں اردو کا پہلا بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں۔"

یہاں پر بھی ایک خلش پیدا ہوتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ کیا ایک خاص ڈھنگ کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور کسی کو اہم ناول نگار بنا دیتا ہے۔ ؟ احتشام صاحب

کی عظمت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے ان کا فرمایا ہوا بلاشبہ قابل قبول بلکہ لائق تقلید بھی خیال کیا جا سکتا ہے ان کے شاگرد تو درکنار اکثر معاصرین نے بھی ان کی تائید فرمائی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ جاگیردارانہ مزاج کے سخت مخالف تھے اور کبھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ جو بات دل میں پیوست نہ ہو اس کو بھی خاطراً تسلیم کر لیا جائے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی سماجی بصیرت جس کو کہا جاتا ہے وہ قدیم تہذیب کی صدائے بازگشت اور روایات سے غیر معمولی محبت ہے۔

بصیرت تو ہم اسے اس وقت قرار دیتے جب رفتار وقت کی آہٹیں وہ محسوس کرتے اور بدلتے ہوئے حالات کا کھلے دل و دماغ سے خیر مقدم کرتے اردو کا پہلا ناول نگار قرار دینا بھی ان کو بحث طلب ہے چونکہ شاد عظیم آبادی نے "صورۃ الخیال" بہت پہلے لکھی اور اس پر تحقیق ہونی چاہیئے کہ کس کی کوشش واقعی درجہ اولیت رکھتی ہے ان باتوں سے میرا مقصد کسی کی تضحیک نہیں ہے بلکہ تنقیدی دنیا میں اور نقاد حضرات کے قلوب میں ایک انقلاب لانا ضرورت ہے اور یہ چاہتا ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے پرائے سب کا جائزہ لیں اور اس خیال کو برقرار رہنے کا اب موقعہ نہ دیں کہ غیر یوپی وغیرہ دہلی والوں کو نظر انداز نہ کیا گیا۔

اسی طرح انیس کے سلسلہ میں بھی میری گفتگو سے کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے بیشک انھوں نے مورخ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اعلیٰ لٹریچر بھی پیش کیا اور فنکارانہ صلاحیتوں کا لاجواب ثبوت بھی دیا لیکن ان لوگوں کی سطح سے تجاوز نہیں کیا۔ جو جنگ کربلا کو رونے رلانے کی چیز سمجھتے رہے ہیں بین کے معاملہ میں تو مرزا دبیر اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ کیا سچ مچ ان ہی نفوس قدسیہ کا ذکر خیر ہے، جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھے پیکر تسلیم و رضا تھے اور ہمارے لیے نمونہ تھے۔

اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے جاگیر دارانہ معاشرے کی بھرپور گرفت اور ادبی سرگرمیوں کو محدود دائرہ میں خیال کر کے حسن ظن سے کام لینا بھلا لگا۔ لیکن دوسروں کی مثال سامنے رکھ کر یہ ماننا ہی پڑا کہ یہ حضرات مخصوص انداز فکر رکھتے تھے۔ اور منصف مزاج نقاد کا فرض ہے کہ ان کا جائزہ لیتے وقت حدود کو نظر انداز نہ کرے چونکہ حدود سے تجاوز کرنا محض اپنے ہی لیے مضر نہیں ہوتا بلکہ اپنے ممدوح کے حق میں بھی کانٹے بونا ہوتا ہے۔

اسی لیے نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ سب کو پرکھنے کے لیے ایک معیار و مقیاس سے کام نہ لے اور دیگر مدرسہ فکر کی روشنی میں بھی ان کا عرفان حاصل کرے تاکہ وہ اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو سکیں۔

مادی نقاد فرائڈین نقاد کو بوڑ ھا اور بہکا ہوا خیال کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے ہمیں ذرا ہیں ہے جس طرح پر تجربہ کیا ہے اور سائنسی انداز سے حقیقت آشنا ہونا چاہیئے؟ اس نے ویسا ہی عمل کیا ہے۔ وسعت نظری کے معنی یہ ہیں کہ ہم مختلف مدرسہائے فکر میں مماثلت تلاش کریں اور دور ہو کر الگ الگ حلقہ نہ بنائیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ زندگی سے کوئی بھی زندگی کی دین کسی وقت بھی الگ نہ ہو سکتی ہے نہ رہی ہے۔ سارے کھیل تو حیات مستعار ہی کے ہیں شعر و ادب بھی عمر رواں ہی کی بخششیں ہیں ان میں دوری کیونکر ممکن ہے۔؟

عہد قدیم ہو یا دور جدید کسی زمانے کا ادب زندگی سے الگ نہیں ہے بس غور یہ کرنا چاہیئے کہ زندگی کی بنیادی طلب حصول لذت ہے۔ اور اسی کو جنس (sex) کہتے ہیں۔ آپ میدان سیاست میں اشتراکی فلسفہ کا سہارا لیں یا جمہوری نظام کے گن گائیں مقصد سب کا یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آسودگی

نفس میسر ہو۔ اب اگر یہ تمنّا کہیں بصورت فرد ہے اور کہیں بہ شکل معاشرہ تو ضدّین کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ اور کیوں نہ ہم قریب سے قریب تر ہو کر کھلے دل و دماغ کے ساتھ سمجھنا چاہیں؟ — عام لوگوں کے مقابلہ میں نقاد کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی وسیع القلبی بہت ضروری ہے اس کی اپنی لیاقت اور صلاحیت ظاہر کرنے کے لیے کوئی دشوار کام نہیں تھا کہ بہت سے ارباب قلم کو پڑھ کر یہ بتایا جاتا ہے کہ تنقید کی قسمیں کتنی ہیں؟ اس طرح کے تراجم بکثرت موجود ہیں اور انھیں اضافہ کر دینا ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ بلکہ اہل فن کے رجحان طبع کو اجاگر کرنا فرض ہے۔

فرائڈ اور ادب

جے۔ڈی۔ برس فورڈ کا کہنا ہے کہ انسانی فطرت کے بارے میں جن ممتاز سائنسدانوں نے اب تک اپنے نظریات پیش کیے ہیں ان میں "فرائڈ" کا کام سب سے زیادہ اہم ہے اور خصوصیت کے ساتھ افسانوی ادب کے لیے اس کی تحقیقات و معلومات خاصی مفید ہے اگر ہم تمام تر اس مفکر سے اتفاق نہ کریں تب بھی اس حقیقت کا تو اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ جدید ادب پر فرائڈ کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی بدولت ادب میں کئی رجحانات پیدا ہوئے مثلاً" سرریلزم" شعور کا بہاؤ۔ تحلیل نفسی داخلی مونولاگ، پرابلم ڈرامے، آٹومیٹک تحریریں اور نفسیاتی سوانح وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک معالج تھا اور اس کے تجربات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو ادیب فرائڈ سے متاثر ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر نے اس کے ابتدائی نظریات ہی کو قبول کیا ہے حالانکہ اپنی بعد کی تحریروں میں اس نے ان میں ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ کچھ ایسے بھی اہل قلم نظر آتے ہیں جنھوں نے فرائڈ کے زیر اثر معاشرتی اصلاح اور نئی اقدار تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض نے مارکس اور فرائڈ کے نظریات کے امتزاج کو بھی پیش کیا ہے۔ جوزف فری مین کے ناول "نیور کال ریٹریٹ" میں یہی امتزاج ملتا ہے۔ میں بذات خود اس قسم کے امتزاج کو نہ غیر فطری محسوس کرتا ہوں نہ دور دراز سے رشتہ جوڑنا

میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ انسان "تحصیل حظ" کے لیے مضطرب ہے۔ قدرت نے یہ مادہ اس میں ودیعت کیا ہے اور اسی حظ کو (sex) کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ گہری معنویت رکھتا ہے اور اپنی کوتاہ فہمی کے باعث ہم نے خاص مفہوم تک اسے محدود کر دیا ہے۔ سماجی پیچ و خم سے الجھنا اور ایک ایسے متوازن نظام کے لیے جدوجہد کرنا جس میں ہر شخص بقدر صلاحیت نشوونما پا سکے تقاضائے بشریت ہے۔ خارجی حالات اس راہ میں قدم لڑکھڑا بھی دے سکتے ہیں اور گم کردہ منزل بھی بنا دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ جس عہد کو غیر مہذب عہد کہا جاتا ہے۔ اس میں فطرت کی بخشی ہوئی اشیاء میں ہلا ردک ٹوک۔ ہر ذی روح کا حصہ تھا۔ جب کسی قدر آگے قدم بڑھایا گیا اور قبائل کی تشکیل ہوئی تو طاقت کا مظاہر شروع ہوا ہر قوی ناتواں کو دبانے لگا مروجہ مذاہب عالم بھی قوت سے تمام تر ہم آہنگ ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قوت کے پرستار ہیں۔ اس کے آگے سر جھکانا سعادت خیال کرتے ہیں اور ناتوانی کے لیے ان کے قلوب میں کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا یہ محسوس کرنا کہ خارجی حالات مارکسزم کی وجہ تخلیق ہیں اور سوشلزم کی خلقت کا سبب ہیں اپنے کو دھوکا دینا یا سطحی طور پر رائے قائم کرنا ہے خارجی حالات خوابیدہ یا بھولے ہوئے جذبے کو بیدار کرنے و یاد کرنے کے لیے تو محرک ہو سکتے ہیں اسے خلق کرنے والے نہیں کہلا سکتے چونکہ ازل سے یہ فطرت انسانی میں موجود ہے۔ حصولِ حظ انسان کی طبیعت ثانیہ ہے۔ لہذا وہ انفرادی طور سے یا اجتماعی طور سے یہ ضرور چاہے گا کہ مسرت کو محدود نہ ہونے دے اور مارکسزم مسرت کی وسعت ہی کا خواہاں ہے۔ وہ چند لوگوں کو دادِ عیش دینے کا حقدار نہیں سمجھتا بلکہ سب کو مساویانہ حیثیت سے جینے کا موقعہ فراہم کرنا چاہتا ہے اور ذرا سے صاف دل و دماغ کے ساتھ غور کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ انسان کی داخلی پکار ہے۔ وہ اس معاملہ میں اپنی جان کی بازی تک لگا دیتا ہے اور مذاہب عالم کے مفروضات کو رد کرتا

ہوا محض حق غصب کرنے والے انسانوں ہی سے نبرد آزما نہیں ہوجاتا بلکہ خدا تک سے بغاوت پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اگر فیض اور ساحر کی شاعری کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو باسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کی عمارت خارجی بنیادوں پر نہیں کھڑی ہوئی ہے بلکہ داخلی بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ "لائنل ٹرلنگ" نے فرائڈ سے متاثر ادیبوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ فرائڈ اور ادب کے مابین نئے نئے رشتے واضح ہوتے چلے جارہے ہیں اگر ہم اپنے کو کتابیات تک محدود کرلیں تو ایک نامکمل فہرست ہی پیش کرسکیں گے پھر بھی اس جنسی انقلاب کا ذکر ضروری ہے جس کا تقاضہ شیلی وجارج سینڈ اور پھر زیادہ گہرے "تنقیدی شعور کے ساتھ" الیس" نے کیا ہے اس طرح فن کی جنسی بنیاد کا نظریہ جیسے ٹائیک نے بیا کی اور شوپنہار نے نفاست کے ساتھ پیش کیا اور جنسی ناہمواریوں کے بارے میں اسٹینڈل کی تخلیقات شہوانی جذبات کے متعلق واضح طور پر فرائڈین سے متاثر ہیں ہمیں ہمیشہ اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ مفید اور افادیت پسند انا کو نسبتاً ادنیٰ سطح کی طرف دھکیلا جارہا ہے اور انتشار پسند و خود کام جبلّی قوت کے حق میں تاویلیں پیش کی جارہی ہیں۔

یہاں پر بے محل نہ ہوگا اگر شہوانیات کے سلسلے میں کچھ عرض کیا جائے۔ شہوت ایک بھوک ہے۔ اور جب تک یہ ذی روح میں باقی رہتی ہے اسی وقت تک اس سے آثار حیات بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ بالفاظ دگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ بھوک زندگی کی نشانی ہے اور اس کا ختم ہوجانا موت کی علامت۔ اب یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ ضعیفی میں عموماً مجامعت کی طلب باقی نہیں رہتی ہے۔ لیکن تحصیل لذت کی خواہش مردہ نہیں ہوتی۔ پھر ہم کیوں نہ یہ سمجھیں کہ شہوت سے مراد انسلاک جسمانی ہی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ قوت ہے جو حصول حظ کی طرف انسان کو مائل کرتی ہے۔ مجامعیت بھی ایک حصول حظ کا ذریعہ ہے اور عام طور پر یہ خیال کرلیا گیا کہ شہوت کا مقصد بس یہی ہے۔ حالانکہ یہ قوت اتنی محدود

نہیں ہے۔ اس میں غیر معمولی وسعت ہے اسی لئے فرائڈ نے بڑے سائنٹفک انداز سے اس کو سمجھا اور محسوس کیا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سب سے الگ تھلگ کر کے انسان کو اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتا ہے اور ایک سرجن کی طرح چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اگر یہ درست بھی ہے تو اس سے نقصان کیا پہونچتا ہے؟ بلکہ وہ انسان کی آگہی کے لیے جس طرح بھی عمل کرتا ہے بلاشبہ کامیاب ہے اور ہمارے سامنے اس کی حقیقت بے نقاب ہو کر آجاتی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اس دنیا میں ایسے پڑے ہیں جو دوسروں ہی کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں بلکہ خود بھی فریب میں مبتلا ہیں اور اقبال کی زبان میں یوں کہنا چاہیئے کہ ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

اسی بے خبری کا نتیجہ ہے کہ ہم نے خارجی حالات کو فن کی بنیاد سمجھ لیا اور اشترا کی تحریک نے جب اپنا لٹریری فرنٹ قائم کرنا ضروری خیال کیا تو ہندوستان بھی پیچھے نہ رہا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل یہاں بھی ہوئی۔ اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں ہے اور بڑی صفائی سے اظہار کرنا چاہیئے کہ اس انجمن کے نمایاں اراکین ایک سیاسی عقیدہ رکھتے تھے اور کمیونزم کے ہمنوا تھے۔ اپنے وقت کے اعتبار سے اس نے مفید کام بھی کیے اور سیاسی شاعری سے مجاہدین آزادی کو تقویت بھی پہونچائی لیکن آزادی کے بعد اس کا کام بڑی حد تک ختم ہو گیا اور جس طرح اشتراکیت کا زور مدھم پڑا اسی طرح اس کا عروج بھی باقی نہ رہا۔ کچھ لوگ محض شہرت کے لیے آج بھی اسے زندہ رکھنے پر مصر ہیں اور اس کی تاویل یہ فرماتے ہیں کہ دور حاضر میں جو مسائل ہیں اور انسانیت کو جس طرح ان سے خطرہ ہے اس کے ماتحت ادیب و شاعر کو سرگرم عمل رہنے کی ضرورت ہے۔

لیکن ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ آزادی کے بعد جو ایک سرے سے دوسرے سرے

تک آگ و خون کا کھیل کھیلا جا رہا تھا اس میں کیا کچھ نہیں لکھنے والوں نے لکھا مگر چند نفوس کے علاوہ کسی پر اثر نہیں ہوا۔ مقصدی ادب کی اہمیت کتنی ہی کیوں نہ بلند کی جائے وہ کوئی موثر و مجرب نسخہ نہ کبھی ثابت ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے حالی اور ان کے ایسے لوگوں نے مل جل کر شاعری کی باگ موڑنی چاہی اور غزل کے بجائے نظم کو عروج دیا مگر کیا غزل گوئی متروک ہو گئی۔؟ اور یگانہ۔ جگر۔ حسرت اور اصغر کی آواز پر کان نہ دھرا گیا۔؟ آرٹ اپنے مقصد کی بناء پر قلب کی گہرائیوں میں نہیں اترا کرتا۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص ڈپٹی نذیر احمد کے انداز پر سوچ رہا ہو اور مراۃ العروس د توبتہ النصوح سے دل چسپی لے۔ پھر لطف تو یہ ہے کہ ذرا سے تغیر سے اپنا فرمایا ہوا رد کر دیا جاتا ہے جب تک چین سے جنگ نہیں ہوئی تھی اور ہندوستان سے بھائی چارہ مستحکم تھا خوب خوب گن گائے گئے ادھر نظر بدلی اور ہم نے فوراً اپنے کہے ہوئے کو فراموش کر کے دوسرا لب و لہجہ اختیار کر لیا یہ انداز لیڈر کے لیے ممکن ہے مناسب ہو لیکن ایک فنکار کے لیے قطعی زیبا نہیں ہے۔ میر اور مومن وغیرہ کا کلام ہمیں آج بھی متوجہ کرتا ہے اور وہ ہنگامی ادیب و شاعر جو کبھی بہت نمایاں تھے ہمارے حافظے میں محفوظ نہیں ہیں۔

فنکار کو اپنے ماتھے پر کسی لیبل لگانے کی ضرورت نہیں ہے اگر اس کی آواز قلب کی گہرائیوں سے بلند ہو گی تو ضرور دوسروں کے دلوں میں گھر کرے گی اور اگر محض حالات کے پیش نظر دماغ سے کام لیا جائے گا تو وقت بدلتے ہی وہ بھی تبدیل ہو جائے گا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ نئے دماغوں میں کیا کیا خیالات اُبھریں اور کس طرح پر سوچنے سمجھنے کا انداز بن جائے۔

یہ صحیح ہے کہ لیلیٰ مجنوں اور سوہنی مہیوال کی طرح آج کردار نظر نہیں آتے اور دل کی دنیا میں بھی انقلاب آیا ہے مگر ہنوز یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ کشش جنسی معدوم

ہو جائے اور حسن وعشق کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ شعروادب وہی جاندار اور پائدار قرار پاتے ہیں جو اپنے اندر آفاقی اور دائمی اقدار سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے "جدیدیت" کو جنم دیا لیکن اس سے قطعی اتفاق نہیں ہے کہ یہ کوئی منظم تحریک ہے اور فنکار پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں کہ وہ یہ کہے اور وہ یہ نہ کہے۔

تجربے کی روشنی میں سمجھنے والوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آرٹ کی تخلیق نہ بہ جبر ممکن ہے نہ مل جل کر ممکن ہے۔ یہ سراسر ذاتی تاثر کا معاملہ ہے اسی لیے ہم جدیدیت کے علمبرداروں میں یہ بات مشترک دیکھتے ہیں کہ وہ "فرد" پر زور دیتے ہیں۔ اور یہ سراسر ایک صداقت ہے کہ ہر فرد مستقل انجمن ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ جس معاشرے میں وہ سانس لے رہا ہے اس کی ترجمانی اس کے کلام میں نہ ہو البتہ کسی تحریک کے احترام میں اسے اپنے دل کی آواز نہیں دبانی پڑتی ہے اور وہ نہیں کہنا پڑتا ہے جو ایک حلقہ یا گروپ کہہ رہا ہے۔

اگر ہم دل ودماغ کے جالے صاف کر کے جدید شعروادب کا جائزہ لیں تو ہمیں ہر قدم پر زندگی سے اس کا رشتہ اٹوٹ اور مستحکم نظر آئے گا۔ اس حقیقت سے چشم پوشی نہ کرنی چاہیے کہ وجدانی فنکار اپنے تخلیقی تجربے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ بعض تجربے اتنے منفرد اور انوکھے ہوتے ہیں کہ وہ مروجہ ہیئتی سانچے میں نہیں سما سکتے اگر زبردستی انھیں مانوس شکلوں میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی تو ان کی ساری انفرادیت اور انوکھاپن ختم ہو جا سکتا ہے۔ شاعری میں عموماً نغمہ کے عنصر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ہمارے اکثر نقاد آہنگ کی بھی بات کرتے ہیں اور ایک کسوٹی بنا کر افسانہ وناول کو پرکھتے ہیں اور جو ان کا اپنا خیال ہے اس کے ماتحت معیاری اور غیر معیاری کا حکم لگاتے ہیں۔ مگر کانٹوں سے نبض رنگ وبو چھونا راس نہیں آسکتا — اور

ہم کسی صحیح نتیجہ پر اسی وقت پہنچ سکتے ہیں جب ماہرین نفسیات کا سہارا لیں اور انسان کی دبی ہوئی خواہشات کو نظر انداز نہ کریں۔

فرائڈ کے نظریے کے مطابق شخصیت کے اجزائے ترکیبی، جنسی خواہش، اس خواہش کا والدین پر مرکوز ہونا اور والدین سے تطبیق کی خواہش ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ شخصیت انسان کے سماجی دباؤ اور رشتوں کا نتیجہ ہے۔ بچہ اپنی کمسنی میں خاندان سماج مذہب اور قومیت کے زیر اثر پرورش پاتا ہے کچھ رجحانات وہ ورثے میں پاتا ہے اور یہ رجحانات جنسی ہوتے ہیں۔ زندگی کی بنیادی شئے جنسی قوت ہے جسے لبڈو کہتے ہیں ابتدائی عمر میں تو گردوپیش کی رکاوٹوں کا شعور نہیں ہوتا لیکن نشوونما کے ساتھ ساتھ پابندیاں بھی بڑھتی ہیں اور ایک منزل ایسی بھی آجاتی ہے جہاں خواہشات اور رکاوٹوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے عام طور پر رکاوٹیں غالب آتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے خواہشات پر فتح حاصل کرلی لیکن حقیقتاً ایسا ہوتا نہیں ہے وہ خواہشات لاشعور میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہر بیٹا باپ کی نقل اتارنا چاہتا ہے اور اس میں ماں کو حاصل کرنے کا جذبہ بھی انگڑائی لیتا ہے یہی اڈی پس کمپلکس ہے۔ شعروادب حقیقتاً لاشعور کی فریاد ہیں جنسی جذبہ جب سماج و مذہب کے دباؤ سے گھٹ جاتا ہے تو اظہار اور آسودگی کے لیے آرٹ کا سہارا لیتا ہے اسی لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ آرٹسٹ تخلیق کے لیے مجبور ہوتا ہے اس کے سامنے یہ سوال نہیں رہتا کہ کیا خلق کرے اور کیا نہ کرے ایک اکتسابی فنکار تو منصوبہ بند عمل کرسکتا ہے مگر وجدانی فنکار نہیں۔ وہ تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ اور خود بے خبر ہوتا ہے کہ اضطراری عمل میں اس سے کیا ظہور میں آیا۔ فرائڈ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ دبی ہوئی خواہشات کا کبھی کبھی ارتفاع (سبلی میشن) ہوجاتا ہے وہ کبھی ایسے رخ پر جھک جاتی ہیں جو سماجی اعتبار سے ارفع سمجھا جاتا ہے ادب اور فن اسی ارتفاع کا مظہر ہیں۔ لیکن یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ خواب، بیداری کے خواب

اور ادب میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب انسان کی نا آسودہ خواہشات کی تسکین و تکمیل کا بدلا ہوا روپ ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب فرائڈ کے نظریات کی روشنی میں گفتگو کی جاتی ہے تو مادی تنقید یا اسی طرح کی دوسری کاوش کا وزن ہلکا کیا جاتا ہے بلکہ ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے تحلیل نفسی کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ قاری کے سامنے زیادہ سے زیادہ رخ اجاگر ہو سکیں اور وہ کسی نتیجہ پر ٹھوس انداز میں پہونچ سکے۔ چونکہ تحلیل نفسی کا نظریہ ہماری تہذیب و نئے ذہن کا بنیادی عنصر بن چکا ہے۔ آج کا انسان نفسیات کے نئے نظریوں کی روشنی میں فرد اور اس کے ذہنی عمل میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے۔

اچھا ادیب اپنے ادب کی بنیاد نظریات پر نہیں بلکہ افراد پر رکھتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ کسی مخصوص نظریے سے فرد کی عکاسی کرنا نفسیاتی صداقت اور فنکارانہ حسن کاری کے خلاف ہے۔ اور یہ بات صحیح بھی ہے۔ ہم کسی مخصوص نظریہ کی عینک لگا کر کردار کا عرفان نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ سمجھنا بجا نہیں کہ ایک خاص طرح کے حالات میں مخصوص طور پر ہر فرد اثر قبول کرے گا۔ اس کا بڑا تعلق ماحول اور بچپن کے تاثرات سے ہے۔ اسی لیے کسی خاص واقعہ یا حادثے کا ردِ عمل ہر شخص پر یکساں نہیں ہوتا یہ دوسری بات ہے کہ "ان فیشن" وہ ہاں میں ہاں ملائے اور اجتماعی طور پر اپنے کو نمایاں کرنے کے لیے آواز بلند کرے۔ جن لوگوں میں فنکارانہ صلاحیت ہوتی ہے وہ اپنا فن کسی کے پاس رہن رکھنے کو آمادہ نہیں ہوتے۔ وجہ یہ ہے کہ آرٹ دبی ہوئی خواہشات کے عقلی رشتہ کے ذریعہ نارمل اظہار کا نام ہے۔ ایک کشمکش سی کیفیت ادیب کے لاشعور میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا محرک خارجی اثر نہیں جسے ہم بادی النظر میں دیکھتے ہیں بلکہ لاشعور میں جاگزیں جذبات و خواہشات ہیں اسی لیے شخصیت کو مجموعی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور محض اس کے لاشعوری محرک کو الگ طور پر بیان کر دینا کافی نہیں۔ فرائڈ اپنے کو

حرف آخر نہیں بتاتا نہ یہ کہتا ہے کہ میرا فرمایا ہوا مستند ہے۔ اس نے خود کہا ہے کہ مجھ سے پہلے شاعر و فلسفی لاشعور کو دریافت کر چکے تھے میں نے محض ایسا سائنٹیفک طریقہ معلوم کیا ہے جس سے لاشعور کا مطالعہ کیا جا سکے۔ چنانچہ فرائڈین نقاد بھی اس پر مصر نہیں ہیں کہ ان کے خیال سے اتفاق کیا جائے البتہ وہ چند حقائق سامنے رکھ دیتے ہیں اب آپ کو اختیار ہے کہ ان کی صداقت کو تسلیم کیجئے یا نہ کیجئے۔ سچائی کسی پر لادی نہیں جاتی بلکہ وہ خود اپنے کو منوا کر رہتی ہے۔ اور یہ ایک بالکل سچائی ہے کہ اہل فن کے اپنے دل کی کچھ پکار ہوتی ہے جب وہ کسی کے سبب سے بھی پس پردہ ہو جاتی ہے اور ان کو دوسرے کی بولیاں بولنا پڑتی ہیں تو وہ کتنے ہی عظیم فنکار کیوں نہ ہوں مصلح لیڈر ریفارمر وغیرہ تو بن جا سکتے ہیں مگر خالص ادیب و شاعر نہیں رہ سکتے فن کا مقصد محض تخلیق فن ہے۔ ایک بلند ترین گلوکار کسی راگ یا راگنی کا الاپ کرتا ہے تو اس میں دوسروں کی فلاح و بہبود پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ اپنی فنکاری کے جوہر دکھانا مد نظر ہوتا ہے۔ اور ہم استاد عبدالکریم خاں یا فیاض خاں کے گن اسی لئے گاتے ہیں کہ انھوں نے آرٹ کے ساتھ دیانت داری برتی ہم کسی بھی فنکار سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ ہمیں راہ ہدایت دکھائے گا۔ جب ہمیں راہ ہدایت دیکھنا ہوگی تو دنیا میں بہت سے راہبر ہیں ہم کسی ایک کی طرف رجوع کریں گے۔ پھر پوری تصدیق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک فنکار فلسفی بن کر اپنے خیال میں جو کچھ ہمیں بتا رہا ہے وہ واقعی درست بھی ہے یا نہیں۔؟ ہو سکتا ہے کہ اس سے ہم متفق نہ ہوں۔ لیکن شاعر و ادیب ہماری دل کی بات کہیں یا نہ کہیں اگر وہ اپنی شخصیت کو پہچانتے ہیں تو ضرور ہمیں متاثر کریں گے مثلاً فراق کا یہ شعر ؎

خدا کو اہلِ جہاں جب بنا چکے تو فراقؔ
پکار اٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

بڑے بڑے راسخ العقیدہ کو بھی تڑپا دیتا ہے۔ فرائڈ جیسے ماہر نفسیات کی نظر میں تخلیقی عمل ایک نیوراتی عمل ہے۔ کیونکہ فنکار حقیقت سے آسودگی کے باعث تمثیلی طور پر اپنی شخصیت کو پروجکٹ کرتا ہے۔ جو لوگ فنکارانہ صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں وہ تکمیل خواہشات کے تصورات کو فن کے ذریعہ خارجی اشکال میں پیش کر کے آسودگی حاصل کر لیتے ہیں اسی لیے ہم ایسے ارباب قلم کو بھی اکثر و بیشتر جاندار پاتے ہیں جو آرٹ کو لاشعور کی دین نہیں سمجھتے اور مادی حالات کی برکت خیال کرتے ہیں۔ وہ ممکن ہے خود بے خبر ہوں۔ لیکن ایک مخصوص انداز کی خواہش ان میں بدرجہ اتم ہوتی ہے اور وہی فن کے ذریعہ خارجی اشکال میں پیش ہو کر ان کو آسودہ کر دیتی ہے۔ تخلیق فن کے معاملہ میں خواہشات کا بڑا دخل ہے جس طرح بغیر خواہش نہ ہم کچھ کھا سکتے ہیں نہ حسن ور آغوش ہو سکے ہیں اسی طرح خالق بھی نہیں بن سکتے ہیں خلقت کی محرک خواہش ہے اور اس کی تکمیل سب سے پہلے فنکار کو آسودہ کرتی ہے۔ لہٰذا کوئی مانے یا نہ مانے فنکار سب سے پہلے اپنے لیے تخلیق فن کرتا ہے اور وہ لاشعوری طور پر اپنی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے فنکار اور غیر فنکار کا فرق بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ غیر فنکار تو اپنی اکتسابی قوت کی بنا پر قاری کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کرنا فرض سمجھتا ہے لیکن حقیقی فنکار کی بے پناہ تڑپ اسے اپنے لیے سکون حاصل کرنے پر متوجہ کر دیتی ہے قرۃ العین حیدر کی زیادہ تر تخلیقات اسی لیے قابل قدر ہیں کہ فنکار نے اپنی آسودگی چاہی ہے اور عموماً بکثرت بکنے والے ناول نگاروں سے مجھے یہی شکایت ہے کہ ان میں خواہشات کا غلبہ نہیں لہٰذا اپنی آسودگی کا سوال بھی نہیں اٹھتا سب کچھ بس دوسروں کی

خاطر کیا جارہا ہے۔

فرائڈین نقادوفن کا تجزیہ اسی بنیاد پر کرتے ہیں کہ کس حد تک کون ادیب اپنے نیوراسس کو ارتفاع کے ذریعہ تمثیلی طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے ان کے لیے فنکار کی شخصیت ہی اہم ہے۔ ابتدائی عمر میں تو ہر بچہ یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ماحول تربیت اور سماجی دباؤ کی بنا پر الگ الگ شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور جو لوگ فنکارانہ صلاحیت رکھتے ہیں ان کے فن میں مترشح ہوجاتا ہے کہ ان کا پس منظر کیا رہا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی فطری خواہشات اور جبلتیں ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں لاشعور میں نہیں چلی جاتی ہیں؟ بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ ضمیر اور سپر ایگو کی گرفت بھرپور ہونے کی وجہ سے رخ مڑ جاتا ہے لیکن یہ رخ مڑنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا اور اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ کسی وقت بھی لاشعور کے مکین شب خون مارنے کے قاعدے پر عمل کریں اور اصلاح و تعمیر کے سارے تانے بانے بکھر کر رہ جائیں۔ ہم کسی کے خلوت کا حال کیا جانیں؟ کون ہے جو اپنا راز نہیں چھپانا چاہتا ہے اور کیسے بہ مصدقہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نفاست و طہارت کی تشہیر کرنے والے نجاست و غلاظت سے کتنا پیار کرتے ہیں؟

ادب کی وسعت سے انکار نہیں ہے اور یہ بھی قابل تسلیم ہے کہ لکھنے والے کو آنکھوں دیکھی لکھنا چاہیئے کانوں کی سنی نہیں۔ مگر صحافت اور شعروادب میں جو فرق ہے اس کا بھی لحاظ مقدم ہے فنکار کسی اخبار کا رپورٹر نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ کون موضوع لے اور کتنا بھرلے ہر واقعہ نہ فن کے سانچے میں سموئے جانے کا اہل ہوتا ہے نہ اول تا آخر اسے قابل قبول کہا جاسکتا ہے ادب کی مستقل ایک الگ حیثیت ہے۔ یہ فنون لطیفہ کی انتہائی نازک شاخ ہے اور جو معیار عمدہ شعر کو پرکھنے کا ہوسکتا ہے وہی افسانے و ناول کا بھی ہوگا۔ شاعرانہ حسن علیحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے

اگر ہم اسے الگ کردیں گے تو فن پارے میں کوئی جمالیاتی کیفیت باقی ہی نہیں رہے گی اور وہ خالص صحافت ہو کر رہ جائے گا۔ یہ بھی خیال بالکل صحیح ہے کہ اچھا ناول لکھنے والا ایک ہی دو لکھ سکتا ہے بقیہ تو محض مشق کی برکت ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ تجربات و خارجی حالات جب لاشعور میں جاگزیں ہوتے ہیں اور اس میں چھپی ہوئی خواہشات سے ہم آہنگ ہو کر اظہار کے نئے راہیں ڈھونڈھنے لگتے ہیں تو فنکار پر درو زہ کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور تخلیق معرض وجود میں آتی ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ نلکی زاوده اور غیر نلکی زاویے میں جو فرق ہوتا ہے وہی عمداً تخلیقی عمل اور فطری تخلیقی عمل میں ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محض عمر میں ایک کتاب لکھ کر مصنف زندہ جاوید ہو جاتا ہے اور بسیار نویس کا نام بھی باقی نہیں رہتا ہے۔ یہی بات کہانی ڈرامے اور شعر کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے تکرار میں بقا نہیں ہے۔ نہ دوسروں کے لیے لکھنے میں کوئی خصوصیت نہیں ہے اپنی آسودگی اور تسکین کے لیے لکھنا ہی اصل چیز ہے۔ اور لاشعور کی اہمیت کو تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے۔؟

چھٹے جو دھند تو آنکھیں بھی دیکھ لیں منظر
پسِ غبار مگر کوئی اور صورت ہے

دیدۂ بینا

جب تک دُھند نہیں صاف ہوتی پس غبار جو صورت ہے وہ نظر نہیں آتی دیدۂ بینا کے لیے ریاضت کے ساتھ ساتھ نفس کو بھی مارنا پڑتا ہے اور قلب میں اتنی صلاحیت پیدا کرنی پڑتی ہے کہ موافق و مخالف سب سما سکیں۔

انسانی فطرت کا یہ پہلو بھی بڑا اہم ہے کہ ذہن پر جو ایک چھاپ پڑ جاتی ہے اس کے ماتحت برعکس مطالعہ اثر انداز نہیں ہوتا اور پہلے ہی قدم سے جذبۂ تردید اپنی جولانیاں دکھانے لگتا ہے۔ آپ کسی ایک مذہب کے ماننے والے کو دوسرے مذہب کی کتابیں پڑھنے کو دے دیں اول تو وہ پڑھے ہی گا نہیں سوچے گا کون اپنا ایمان خراب کرے؟ اور اگر کسی قدر روشن خیال ہے تو مطالعہ اس نیت سے کرے گا کہ رد کے امکانات پیدا ہوتے جائیں۔ اسی لئے مقدم ہے کہ ہم خالی الذہن ہو کر مطالعہ کریں اور رد و قبول کی پہلے سے کوئی نیت نہ ہو۔ محض اپنے مکتب خیال کو حرف آخر تصور کرنا بصورت دیگر سارے مکاتیب کو ناقص قرار دینا ہے۔ مذہبی دنیا میں تو ممکن ہے یہ عیب نہ ہو لیکن ادبی دنیا میں ضرور عیب ہے۔ اس گلستان رنگ و بو کی تہذیب اما سر گرہ

یہ اجازت نہیں دیتی کہ محض اپنے ہی فرقہ کو ناجی خیال کیا جائے اور دوسرے فرقوں کو نجات سے محروم سمجھا جائے۔ نقاد کے لیے بکثرت علوم و فنون کی واقفیت اسی لیے ہی کہی گئی ہے اور کم و بیش ہر صاحب الرائے نے اس کا اظہار ضروری سمجھا ہے کہ اس میں یک رخاپن نہ آنے پائے اور وقت ضرورت وہ اس کسوٹی پر بھی فن کو پرکھے جو اس کی پسندیدہ نہیں ہے۔

ذاتی پسند ہر شخص کی الگ الگ ہو سکتی ہے اور اس پر کسی کو اعتراض کا حق بھی نہیں ہے لیکن جس طرح کوئی یونانی طریقۂ علاج کو سب سے افضل سمجھتا ہے یا ہومیوپیتھ کو درست خیال کرتا ہے لیکن اپنی یا اپنے چہیتوں کی بیماری میں انھیں ناکام پاکر ایلوپیتھک یا ویدک کی طرف مخاطب ہو جاتا ہے اسی طرح کسی صاحب قلم کو گہرائی سے سمجھنے میں اگر اپنے نظریہ سے آسانی نہیں ہو رہی ہے تو دوسرے نظریہ کو کام میں لانا نہ ڈھلمل یقین ہونے کی علامت ہے نہ ڈانواڈول ہونے کی۔

مریض کی صحت یابی کے لیے ہر طریقۂ علاج کو آزمانا اگر جائز ہو سکتا ہے تو قریب سے قریب تر ہونے کے لیے دیگر طریقۂ تنقید سے فائدہ اٹھانا کیوں معیوب سمجھا جائے؟ نقاد کی وسیع معلومات پر اسی لیے تو اصرار کیا جاتا ہے کہ اس کے پاس ہر طرح کے ہتھیار آزمانے کے لیے ہوں اور وہ کہیں پر اپنی تہی دامنی کا شکوہ نہ کر سکے۔ اس سے نہ اُس کے مسلک پر کوئی حرف آتا ہے نہ وقار میں فرق بلکہ کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

تنقید نگار کا یہ رول نہیں ہے کہ وہ دور دراز نگاہیں گاڑے رکھے اور ہر لمحہ یہ دیکھے کہ ہم نے اپنے کو جن کے دامن سے وابستہ کر لیا ہے ان کا اصول حیات کیا تھا؟ وہ نہ کسی خانقاہ کے پیر کا مرید ہوتا ہے نہ

کسی عالم کا مقلد وہ استفادہ تو سب سے کرتا ہے لیکن اپنے طور پر چھان بین کر کے صاحب الرائے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ملک کے جملہ حالات و کوائف کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ اسی خصوصیت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم اپنے ارباب قلم کو جب تک کسی بیرونی فنکار کا مماثل نہیں ثابت کر لیتے ہیں ہمارے قلب کو تسکین نہیں ہوتی ہے حالانکہ یہ بڑائی نہیں سراسر غلامانہ فطرت کی دلیل ہے۔ پریم چند انڈین ٹالسٹائی کیوں محسوس ہوئے؟ کیا اپنے دیسی فریم میں جڑ کر ان کی تصویر دیکھنے کے بعد ہمیں اس کا احساس نہ پیدا ہو سکا کہ وہ ٹالسٹائی سے بھی کچھ آگے تھے۔؟ شاعر مشرق علامہ اقبال کی فکر و نظر پر تو ہم نے خوب روشنی ڈالی مگر اس کا بکثرت اقرار و اعتراف نہیں کیا کہ ان کے محاسن شعری اور اسلوب میں کتنی کشش تھی۔ نظم کہنا صحیح معنوں میں وہی جانتے تھے۔ انھیں اس کا علم تھا کہ نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ درمیان سے ایک شعر بھی نکال دیا جائے تو پوری عمارت گر پڑے۔ چنانچہ ماہر اقبالیات ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کو بھی کہنا پڑا کہ ان کے حسن بیان پر اب تک کام نہیں ہو سکا ہے۔

میرا مقصد کسی کے سر سے تاج اولیت اُچکنا نہیں ہے۔ نہ میں اپنے کو اس بہانے نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔ بحمد اللہ جتنی بھر شہرت میرے حصہ کی تھی وہ مل چکی ہے اس سے زیادہ کی خواہش بھی نہیں۔ البتہ جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ اپنے تجربات کے ماتحت جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ دوسروں تک بھی پہنچا دوں۔ مولانا حالی کی بلندیوں میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ انھوں نے نقد و نظر میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور مغربی تسلط کے پیش نظر یہ چاہا کہ شعر و ادب سے کچھ کام لیے جائیں اور اسے مقصدی بنا دیا جائے۔ چنانچہ وہ خود ارشاد

فرماتے ہیں ؎

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اتباع مصحفی و میر ہو چکی

اس میں بہت کچھ دخل داغ کے رنگ سخن کا بھی تھا اور لکھنؤ کی کمزور ذہن کی شاعری کا بھی۔ اسی طرح تحریک آزادی نے جو فضا تیار کرنا شروع کی تھی اور انقلاب روس کا جو اثر پڑا تھا اس نے مارکسی نقطہ نگاہ کو پھیلانے میں خاصی مدد دی اور اس طرح کی کاوش نہ نظر انداز کی جا سکتی ہے نہ اس کے افادی پہلو سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ مگر تغیرات زمانہ کے ماتحت کسی انداز نگاہ کو جامد خیال کر لینا اور جن حالات میں مندرجہ بالا فکر کو عروج ہوا تھا اسی طرح بدلے ہوئے حالات میں دوسرے رجحان کو پنپنے نہ دینا اور لکیر کے فقیر بنے رہنا عمل ارتقاء کو روکنا بھی کہلائے گا۔ اور اس کی نفی کرنا بھی۔

مجھے احتشام صاحب کی شرافت لیاقت صلاحیت اور خصوصیت کا بخدا قلب سے اعتراف ہے۔ میں ان کی بڑائی کا بھی منکر نہیں ہو سکتا لیکن ایک بت بنا کر ان کو پوجنا بھی ضرور ناپسند کرتا ہوں۔ وہ بڑے وقت شناس انسان تھے اور پہلے ہی قدم پر سمجھ لیتے تھے کہ ہوا موافق ہے یا نہیں ہے؟۔ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ ان کا مذاق شاعرانہ اور کہانی تخلیق کرنا بہ سرعت اس مقام تک نہیں پہنچا سکے گا جس کے وہ مستحق ہیں لہذا تنقید کی طرف متوجہ ہوئے اور ترقی پسندوں کے اثرات اور عروج کو دیکھتے ہوئے مارکسی نظریہ کے علمبردار بن گئے۔ لیکن فی نفسہٖ مارکسزم سے انھیں باطنی لگاؤ نہیں تھا۔ لاشعوری طور پر وہ مذہبی انسان تھے اپنی روایات و میراث سے بھرپور

طور پر وابستہ تھے مروّت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اسی لئے پیش لفظ و مقدمہ لکھنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ کسی کا دل توڑنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ وہ اختلافاً مبتدی کی کاوش پر بھی اپنی مہر لگا دیتے تھے اور تضاد کے درمیان سے اس طرح نکل جاتے تھے کہ ہر دو فریق میں سے کسی کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوتی تھی۔ یقینی یہ ان کا ہنر تھا۔ لیکن اس وقت بڑی حیرت ہوئی ہے جب وہ مولانا اختر علی تلہری مرحوم کے جواب میں ترقی پسندی کی وضاحت کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:۔

"ترقی پسندی کو جدید ادب یا موجودہ زندگی
کے تمام رجحانات سے کوئی تعلق نہیں ہے"

اسی طرح جب رشید احمد صدیقی نے "ترقی پسند ادب" کے نام سے ایک مضمون لکھا تو انھوں نے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ:۔

"ترقی پسند ادب کے متعلق بعض ایسی کمزوریاں
منسوب کردی گئی ہیں جن کا تعلق ترقی پسند ادب سے
نہیں اگر اس مقالہ کی سرخی نیا ادب یا جدید ادب وغیرہ
ہوتی تو یہ عرض کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی"

آگے چل کر اسی مضمون میں رقم طراز ہیں:

"یقیناً جدید ادب کے یہ عنوانات بھی ہیں لیکن
صرف اسی وقت تک جب تک کہ جدید اور ترقی پسند میں
فرق ملحوظ نہ رکھا جائے"

معلوم یہ ہوا کہ ہر نیا و جدید ادب ترقی پسند ادب نہیں ہوتا۔ ور ترقی پسند ادب کی دنیا بہت محدود ہے اسے بقول پروفیسر سید

احتشام حسین رضوی مرحوم :-

"موجودہ زندگی کے تمام رجحانات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب ذرا سوچیے کہ شعر و ادب جو زندگی کے تمام رجحانات کو احاطہ کئے ہوئے ہیں اور ہم اس ہجوم رنگ و بو میں پوری تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں وہ ایک ترقی پسند و مارکسٹ نقاد بن کر کہاں ممکن ہے ۔؟

حالانکہ مرحوم احتشام حسین مرحوم کی بالغ نظری اور وسیع القلبی خود اسے گوارا نہیں کرتی تھی اور قید و بند کی زنجیریں توڑ دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ جہاں وہ یہ فرماتے ہیں" ادب مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے" وہاں یہ بھی ارشاد کرتے ہیں:

" انسانی شعور کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر فنکار کے اصل مقصد کو ڈھونڈ نکالنا اور اس کے فن کے محرکات کا پتہ لگا لینا اچھے ترقی پسند نقاد کا کام ہے"

اسی روشنی میں نڈر اور بے باک قلم ظ انصاری نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

" احتشام صاحب بظاہر تو آپ خط مستقیم کے نقاد تھے۔ ایسے شخص کے لیے سارے مسئلے طے شدہ ہوتے ہیں ہر بات کا دو ٹوک جواب اس کی جیب میں دھرا رہتا ہے مگر آپ کی سادہ سی شیروانی کے بٹنوں تلے کیا کوئی بڑا خلفشار برپا تھا ۔؟ کیا نتیجوں پر پہنچے سمٹے

آپ بھی پیچ در پیچ ان دیکھی جانی انجانی کشمکش سے دوچار ہوا کرتے تھے۔؟ آپ کے یہاں کے صراط مستقیم کی راہ میں شکوک کے کتنے گوکھروبچھے تھے یہ وہی کچھ لوگ جانتے ہیں جو نزدیکاں بے بصر ہیں نہیں بلکہ دوران بے خبر ہیں سے ہیں۔ آپ کے خطوط نے مجھے یہ شرف بخشا تھا اور کوئی زمانہ ایسا نہ گزرا جب آپ پر رشک نہ آیا ہو۔

سرور صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ آپ کا ننھا سا بچہ کھیلتے کھیلتے سامنے آیا آپ نے پوچھا کیا بات ہے

کیا چاہیے۔؟ ابا جان الجھن ہو رہی ہے کچھ نہیں چاہیے۔

آپ بے اختیار ہنس پڑے۔ دیکھو ننھا سا بچہ اسے الجھن ہوتی ہے نہو" اس نے یہ لفظ مجھ ہی سے سیکھا۔ میں ہر وقت الجھن کا لفظ دہرانے لگا ہوں۔

احتشام صاحب یہ الجھن بڑی مبارک ہے یہ تفکر سے پیدا ہوتی ہے یہ وہی تفکر ہے جس کے لیے فرمایا گیا ہے۔

گھنٹے بھر کی سوچ سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔" جن لوگوں نے کسی دین یا ازم کی بصارت ہی کو نجات کا راستہ سمجھ رکھا ہے وہ اس الجھن سے پاک رہتے ہیں۔ ان کا ماتھے پر سجدوں کا داغ اور ہتھیلی میں ایک گھونسہ محفوظ رہتا ہے پیٹ کے اوپر کتاب کا وہ نشان نہیں ہوا کرتا جو آپ کی بنیائن کے نیچے چھپا ہوا کرتا تھا۔"

یہ ہیں اس شخص کے الفاظ جو روس کے جگر کا ٹکرا ہے مارکسسٹ ہے اور بنیادی طور پر ترقی پسند۔ لیکن ایک نقاد کے لیے ضروری نہیں سمجھتا گروہ بند ہے کہ اصول پرگامزن ہو اور یقین و اطمینان سے ہم کنار ہو کر فیصلہ کرے۔ اسے بھی تفکر کی الجھن بھلی لگتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا لائق تحسین و آفریں معلوم ہوتا ہے۔

نقاد نام ہی اس ذات گرامی کا ہے جو گہرائی میں ڈوب کر موتی نکال لانے کی سعی پیہم کرے اور اگر آج ہم احتشام صاحب مرحوم کے سلسلہ میں سائنٹفک تنقید مارکسی نقطۂ نگاہ جدلی مادیت اور ترقی پسندی وغیرہ کی بات پس پشت ڈال کر ان میں جو واقعی خوبیاں اور خصوصیات تھیں ان پر اظہار خیال کریں تو شاید ہمارا زاویہ نگاہ کسی کے لیے بھی پسندیدہ نہ ہوگا اور ایک موقعہ پر مجھے اس کا تجربہ ہو بھی چکا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تنقیدی نظر ڈالنی چاہی تو کچھ لوگوں نے گوارا نہ کیا حالانکہ اس طرح حقیقت کا منکشف ہونا ان کی عظمت میں اور اضافہ کرتا ہے۔ لیکن جس معاشرے میں ہنوز ایک رنگ کی عینک آنکھوں پر لگا کر دیکھنا پسندیدہ خیال کیا جا رہا ہو اس میں آپ صحیح تنقیدی شعور اور اعلیٰ نقاد کی امید کیا کر سکتے ہیں۔؟ گھما پھرا کر سب ایک ہی بول بولتے ہیں ــــ اور احتشام صاحب مرحوم کو مارکسی نقاد قرار دینا بڑی بات سمجھتے ہیں۔ اپنا کچھ کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ یا یوں سوچا جائے کہ مطالعہ وسیع نہیں ہے صرف ایک ہی دائرہ میں چکر کاٹا گیا ہے وہ امتحان میں کامیابی کے لیے لیاقت و صلاحیت پیدا کرنے کے لیے نہیں۔ پھر دیدہ بینا میسر ہو تو کیونکر ــــ؟

نقاد کسی ایک پہلو پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کر کے صحیح فرض ادا نہیں کر سکتا اس کا منصب بہت اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کس نے کتنا کچھ اپنے اندرونی وجود کی تحریک پر لکھا اور کہا ہے اور کتنا کچھ زمانے کی خاطر خلق کیا گیا ہے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے مراثی منقبت یا نعت کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس کا لحاظ بھی کرنا پڑے گا کہ جو شخص اللہ کے وجود کا قائل نہیں ہے وہ اللہ والوں سے اظہار حقیقت کس بنا پر کر رہا

ہے۔؟ اگر ان کے کردار شخصیت اور اوصاف حمیدہ سے متاثر ہوکر بے خراج عقیدت پیش کر رہا ہے تو کہیں لاشعور میں گھر ماحول خاندان تعلیم اور تربیت کے اثرات تو نہیں کلبلا رہے ہیں؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جس شدت سے اکابرین اسلام کی طرف اس کی نگاہیں اٹھی ہیں اس شدت سے دیگر مذاہب کے مثالی کرداروں کی طرف نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ غیر محسوس طور پر اسلام شیعیت اور عقیدت محرک ہوں؟ تفکر کا لبادہ اوڑھ کر وہ شعوری طور پر خود بھی یہ سمجھ رہا ہو کہ اس نے سب سے پیچھا چھڑا لیا لیکن حقیقتاً ایسا نہ ہو؟ یا مخصوص مزاج والوں کی خوشنودی منظور ہو۔؟

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ دائرہ کار اپنے منصب کے مطابق جتنا وسیع ہونا چاہیئے تھا وہ چند حضرات میں تو بے شک دکھائی دیتا ہے عام طور پر نظر نہیں آتا۔ صاف ظاہر ہے کہ تنقید کے لیے جو فطری صلاحیتیں ضروری ہیں وہ سب کے حصہ میں نہیں آئی ہیں۔

میں نے پچھلے اوراق میں اسلوب احمد انصاری کو سلیقہ کا نقاد مانا ہے مگر ان کے یہاں بھی یہ بات مجھے کھٹکتی ہے کہ وہ ہئیت و مواد کی وحدت کو نہ تسلیم کرنا متبدیانہ عمل ٹھہراتے ہیں۔۔۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جب تک کسی کے پاس کوئی بات کہنے کو نہیں ہوتی وہ لب کشا نہیں ہوتا۔ اس لیے انداز بیان اور موضوع گفتگو لازم و ملزوم ہیں اور ان کی لکھائی میں شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ایک اچھے نقاد کے لیے یہ بھی دیکھنا واجب ہوتا ہے کہ دونوں آپس میں کس طرح گھل مل گئے ہیں اور شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ اگر فن کی دھیمی دھیمی آنچ پر یہ ہر دو اجزاء پک کر اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ ان کو جدا کرنا یا یہ بتانا کہ مواد ایسا ہے اور انداز بیان ایسا ہے ممکن نہیں رہا ہے تو

بے شک فنکارانہ عمل اور فنکار اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو جاتے ہیں اور اگر ان کی انفرادی شناخت قائم رہتی ہے یا ہو سکتی ہے تو ان کی حیثیت گورکی ڈپٹی نذیر اور ان کی تصانیف کی قرار دی جائیں گی جن سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو طبقاتی کشمکش سے دلچسپی رکھتے ہیں یا پرانی قدروں کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں عمومیت کی حدود میں داخل ہو کر یہ زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے پرکشش اشیاء نہ ہوں گی۔ اور جو ناقدین دعویدار ہیں کہ عوامی ادب حقیقی معنوں میں جاندار و صحیح ادب ہے انھوں نے کبھی کھل کر اس کا اعتراف نہیں کیا کہ اس طرح کا ادب ایک مخصوص مسلک و طرز حیات کا ترجمان ہوتا ہے۔

"۔ ژاں پال سارتر نے تو صاف صاف کہا ہے کہ جب اکثریت تباہ حال ہو تو ایسا ادب پیش کرنا جسے استحصال کرنے والی قوت پسند کرے حقیقتاً ان کا ساتھ دینا ہے اور اس طرح ادیب و شاعر بھی مخالف صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

یہ خالص سیاسی نظریہ ہے اور بالفاظ دگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اپنے عروج و اقبال کے دور میں استحصال کرنے والی طاقتیں فنکار کو اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے تھیں اسی طرح آج برعکس طاقتیں عمل کرنا چاہتی ہیں۔ اور فی نفسہٖ صاحب قلم کو کسی عہد میں بھی آزادی سے ہم کنار ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ مگر کوئی انصاف سے بتائے کہ کسی بھی مستند نقاد نے اس راز پر سے پردہ ہٹایا؟ بلکہ بیچارے پریم چند کو اونچا ثابت کرنے کے لیے اسی کا سہارا لیا اور ان کا عوامی ادیب ہونا بڑائی کی دلیل قرار دیا۔ حالانکہ ان کا فن اپنی شخصیت کی پکار ہے وہ افلاس و غربت کی جس چکی میں پس رہے تھے اس کا تقاضہ ہی

یہ تھا کہ اردو ادب کو "دھنیا" جیسا لازوال کردار دیں اور گئو دان جیسی انمول تخلیق نذر کریں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جھونپڑے میں رہ کر محلوں کا خواب نہیں دیکھا کسی روشن امکان کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اپنے گھر کے سامنے بہتے ہوئے نالے کو جوئے شیر قرار نہیں دیا اور دیانت داری کے ساتھ جو تھا وہی ظاہر کیا ہے۔ لیکن ان کی اس بے پناہ عظمت کی طرف ناقدین نے توجہ فرمانا کسرِ شان سمجھا اور اپنے علم و اعتقاد کے ماتحت ان کی قدر و قیمت مقرر کی۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نقاد کا یہ منصب نہیں ہوتا کہ وہ تخلیق کار کو اپنے اصولوں پر پرکھے بلکہ اس کی بلندی اس میں پوشیدہ ہے کہ صاحب قلم کی زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کر کے اسے حتی الامکان وہی بتائے جو واقعی وہ ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ایسے دیدہ ور کمیاب ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جسے بظاہر اپنے نظریات کے قریب پاتے ہیں اس پر تو ہم فوراً نگاہ ڈالنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن ان اربابِ فن تک ہماری رسائی نہیں ہوتی جن کی لے مدھم اور لہجہ عام نہیں ہے۔ لہٰذا بہت سے صاحبانِ کمال پس پردہ ہوتے رہے ہیں اور یہ ہمارے زبان و ادب کا وہ المیہ ہے جس پر خون کے آنسو بھی بہائے جائیں تو کم ہوگا۔

جس طرح بکثرت لکھنا کوئی حسن نہیں۔ اسی طرح بکثرت نقاد کا بھی کسی ملک میں ہونا فالِ نیک نہیں۔ کم لکھیے اور کسی موضوع سے بھی دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد مختصر کیجیے۔ کوئی کمی اس سے واقع نہیں ہوتی۔ ایک کتاب ہزاروں پر بھاری ہو سکتی ہے اور ایک اعلیٰ نقاد لاکھوں میں کافی ہے۔

کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص لکھنا واجبات میں سمجھے اور ہر پڑھا لکھا انسان

شعر و ادب کا نقاد ہونا بھی لازمی خیال کرے۔؟ دنیا میں کرنے کے لیے بہت سے کام ہیں اور لکھنے کے لیے موضوعات بھی بے شمار ہیں۔ اقتصادیات۔ سماجیات معاشیات سائنس الغرض جدھر طبیعت مخاطب ہو اُدھر توجہ فرمائی جائے اس طرح کچھ گراں قدر چیزیں بھی سامنے آئیں گی مختلف اقسام کے لکھنے والوں کا اضافہ بھی ہوگا اور زبان و ادب میں کوئی تکرار بھی نہ دکھائی دے گی۔ خواہ مخواہ ایسا عمل کرنا جس میں کوئی تنوع اور جدت نہ ہو دوسروں کا وقت ضائع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بھی برباد کرنا ہے۔ مفید کام تو جب ہو کہ کوئی اضافہ کیا جائے یا نئی راہیں دکھائی جائیں۔ قدم بہ قدم چلے جانا کون سی خوبی ہوئی۔؟ اور کس نے مجبور کیا ہے کہ نقاد بنیئے۔ معلم ہونے کے بعد بھی آپ پر یہ پابندی تو عائد کی نہیں جاتی کہ دنیائے نقد و نظر میں بھی اپنے جوہر دکھائیے۔ ورنہ آپ کے بلند مدارج میں روڑے اٹکائے جائیں گے۔ اور جو کچھ مل رہا ہے اس میں تخفیف کردی جائے گی۔ کسی درسگاہ میں درس دینا ایک الگ کام ہے اور تنقید کرنا ایک الگ کام آپ کو جو کچھ نذر کیا جاتا ہے وہ معاوضہ درس تدریس ہوتا ہے کوئی نقد و نظر کا صلہ نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قوت نقد و نظر ایک اعلیٰ صفت ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمارے درمیان یہ صفت رکھنے والے نایاب یا معدوم ہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں۔ صرف ضرورت اس کی ہے کہ وہ اپنے طور پر اپنا جائزہ آپ لیں اور سعادت مندانہ انداز میں اپنا فرض ادا نہ کریں۔ ان کی اپنی بھی کوئی حیثیت ہونی چاہیے۔ اور اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے بس کا یہ روگ نہیں ہے تو قطعاً نہ اپنی جان کو لگائیں اور بڑی بیباکی و دلیری سے کہہ دیں کہ " ہم اس کے لیے نہیں بنے ہیں۔"

نقاد کے کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اس کا فرمایا ہوا آنے والے زمانہ کے لیے نہ صرف سند بلکہ مشعل راہ بھی ہوتا ہے۔ اگر اس نے کچھ آگے بڑھ کر قندیلیں روشن نہ کیں تو تاریخ اسے کبھی معاف نہ کرے گی اور مقلد بنا کر اوزان کر دے گی۔ اس کی حیثیت ایک مجتہد کی ہوتی ہے وہ اجتہاد کرتا ہے اور اپنے استادوں کے پیچھے پیچھے ہاں باندھے نہیں چلا کرتا۔ ادب و احترام بجا لیکن اچھا استاد اپنے شاگرد کی اصلاح تعمیر اسی لیے کرتا ہے کہ مستقبل میں سناٹا نہ رہے۔ آپ محسوس نہیں کر سکتے کہ ایک نیک نفس استاد کو اپنے ہونہار وصلاحیتوں سے بھرپور شاگرد کو بام عروج پر دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اس کی بہترین تمنا ہوتی ہے کہ جہاں سے ہم نے چھوڑا ہے وہاں سے ہماری نئی نسل کام کو آگے بڑھا کر کچھ ایسے نئے گل بوٹے دریافت کرے جو ارباب چمن کی آنکھوں سے ہنوز پوشیدہ ہیں۔ اور جن کی تلاش اس لیے بھی ضروری ہے کہ کہیں وقت کا دھارا ان کو دور نہ پھینک دے اور ہم اپنی میراث سے محروم نہ ہو جائیں۔ کوئی بھی لائق بزرگ یہ نہیں چاہتا کہ عمل ارتقاء میں فرق آئے۔ اور کسی کو یہ کہنے کا موقعہ ملے کہ جمود ہے یا رکی ٹینشن۔

آپ کی علوم و فنون سے زیادہ سے زیادہ باخبری قابل قدر لیکن صلاحیت تلاش و تجسس بھی لازمی ہے۔ اگر یہ مادّہ نہیں ہے تو آپ محقق تو بن سکتے ہیں۔ تنقید نگار نہیں۔ ایک اعلیٰ نقاد کا فرض ہے کہ وہ جس فنکار پر قلم اٹھا رہا ہو سب سے پہلے اس کے رشحات قلم کے محرکات کو ڈھونڈے اور اس کی کھوج لگائے کہ اس کی فکر کا منبع کہاں ہے۔ اور لاشعور میں جڑیں کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

آغا حشر کاشمیری کی صدی منائی گئی۔ جس کو دیکھیے ان کے گن گا رہا ہے۔ بے شک وہ بلا کے ذہین تھے۔ اڑان کی طاقت ان میں بہت تھی فطری طور پر

فنکارانہ عناصر بھی ان کی ذات میں جمع ہو گئے تھے اور ایک باکمال آرٹسٹ میں جو خصوصیات ہونی چاہئیے وہ بدرجہ اتم ان میں تھیں۔ لیکن طبعاً اوباش اور عیش پسند تھے۔ داد عیش دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ حصول زر چاہتے تھے اور قاری کی ضیافت طبع کا سامان بیدریغ مہیا کر کے ہر دلعزیز بننا چاہتے تھے۔ چونکہ بغیر اس کے ان کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک ان کے ڈراموں کو بکثرت لوگ پسند نہ کرتے دوسرے ڈرامہ نگاروں کے مقابلہ میں وہ عوامی مقبولیت میں آگے نہ نکل جاتے تاجر پیشہ پارسی تھیٹریکل کمپنی کے مالکان انھیں کیوں منھ مانگا دام دیتے؟ لہذا انھوں نے سارا زور دوسروں کی طلب پر دیدیا اور ان کا اپنا ارمان کیا تھا اسے پس پشت ڈال دیا۔ ان کے فن میں ان کے اپنے دل کی دھڑکن سنائی نہیں دیتی سب کچھ دوسروں کی مانگ نظر آتی ہے۔ آنکھ کا نشہ جو ان کا معرکتہ الآرا ناٹک ہے اس میں وہی مفروضہ پیش کیا گیا ہے کہ طوائف کے پہلو میں دل نہیں ہوتا اس کی پوری زندگی چھل کپٹ سے بھرپور ہے۔ محبت کرنا تو وہ جانتی ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ترکی حور میں شرابی کی مذمت حد اعتدال سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔ نیک پروین میں قمار بازی کی دل کھول کر برائی دکھائی گئی ماضی قریب کے لوگ جو باوجود سب کچھ کرنے کے تصویر کا سیاہ رخ بھی دیکھنا چاہتے تھے ان کی آسودگی کا تمام تر خیال رکھا گیا ہے دل کی پیاس ڈرامہ میں بھی مغربی تعلیم و تربیت کی پروردہ خاتون کو دل پھینک آواری اور شوہر سے بے نیازی برتنے والا پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جب ان کا ستارہ بلند ہوا سرکار نے توجہ دی صدی منائی جانے لگی تو ہر نقاد کم و بیش محاسن ہی کی طرف متوجہ ہو گیا کیا یہ طریقۂ نقد و نظر صحیح ہے؟ اور ایک ناقد کا یہ منصب نہیں ہوتا کہ ہر دو پہلو اجاگر کرے؟ دیدۂ بینا جن کو میسر ہوتا ہے

وہ اعتدال و توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اور گام گام پر اس کا لحاظ کرتے ہیں۔ لیکن یہ نعمت بآسانی نصیب کسے ہوتی ہے؟ محض علوم و فنون کی برکت مطالعہ کی کثرت اور کتب بینی انصاف کے جوہر عطا نہیں کرتیں۔ اس کے لیے اپنی مخصوص طبیعت و فطرت بھی ہوتی ہے۔ جس میں عدل جہانگیری کی طرح نور جہاں ہی کے معاملے میں دل پر جبر کر کے منصفانہ فیصلہ کرنے کا وجدانی جذبہ نہ ہوگا اس سے تو لغزش ممکن ہی ہے؟۔ اور ہمارے یہاں لغزشیں عام ہیں۔ کوئی بھی نقاد جو آغا حشر پر قلم اٹھانے کے لیے تیار ہوا اس پر روشنی نہیں ڈالی کہ فن کارانہ طور پر ان کا مزاج اس سے بالکل مختلف تھا جو وہ پیش کرتے تھے۔ ان کے لاشعور کی پکار کچھ اور تھی اور شعور کی کچھ اور اس لیے ان کے رشحات قلم ایسے آئینہ نہیں ہیں جن میں ہم ان کی تصویر یا عکس دیکھ سکیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ فن کار کی تصویر یا عکس دیکھنا کوئی ضروری تو نہیں ہے۔؟ میں بصد ادب عرض کروں گا کہ بغیر اس عرفان کے منزل تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ غالب کے خطوط جب تک گہرائی سے نہ پڑھے جائیں اور ان کا یہ تحریر کرنا جب تک ذہن میں نہ رہے کہ

غزلوں پہ غزلیں تو اصلاح کے لیے ہمیشہ بھیجتے رہتے ہو کچھ حالات سے مطلع نہیں کرتے۔

اس وقت تک ان کو بے خبر کہا جاتا رہے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ روم جل رہا تھا نیرو ——— بانسری بجا رہا تھا ۔ ان مکاتیب ہی کی روشنی میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تلاش و تحقیق کا مادہ غیر معمولی تھا۔ وہ ظاہر و باطن کی آگاہی چاہتے تھے۔ اور خواب خرگوش کے مزے لینے والوں میں نہیں تھے۔

بالکل اسی طرح آغا حشر کا بھی معاملہ ہے۔ ان کی نگاہیں دنیا پر بڑے استہزائیہ انداز میں اٹھتی تھیں۔ وہ اپنی ہی صحبتوں میں انتہائی پھوہڑ زبان کے انسان تھے

ان کے خطوط واقعات اس کے شاہد ہیں کہ انھوں نے بڑے بڑوں کو اپنی پیچھے دار دشنام طرازی سے نوازا ہے اور باوجود کاری زخم لگانے کے کسی کو بھی ٹوٹنے کا موقعہ نہیں دیا ہے وہ فطرتاً انقلاب پسند تھے معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں تھے لیکن حصول زر کے لیے ماحول سے آگے بڑھ کر ترقی پسندانہ قدم نہ اٹھا سکے جو ان کے اکثر معاصرین کے یہاں محسوس ہوتا ہے! کسی نے بھی اپنی عظمت و جلالت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے یہ نہیں کہا۔ بلکہ گھما پھرا کر یہی بات دہرائی کہ وہ بڑے فنکار تھے اور خارجی تاثرات کی نقاب کشائی کرنے میں پیش پیش۔

سب سے پہلے تو نقاد کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت ضروری ہے کہ کیا خارجی حالات کی عکاسی ہی فنکار کی بڑائی کا ثبوت ہے۔؟ اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو صحافی بھی اسی زمرے میں آجاتے۔ خارجی حالات ہی سے تو ان میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے؟ لیکن ادیب و شاعر کے محرکات مختلف ہیں کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعہ بیان کرے۔ اس کی خلاقانہ طبیعت از خود یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کون سی چیز اس کے بیان کرنے کی ہے اور کس حد تک ہے۔ اور کون سی چیز نہیں بیان کرنے کی ہے یا مختصر پیرائے تمام بیان کرنے کی ہے۔؟ اہل فن براہ راست نقیب و پروپگنڈسٹ نہیں ہوتے۔ گرد و پیش کے حالات ضرور ان پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں لیکن کس طرح وہ قبول کرتے ہیں اور کیونکر لاشعوری خزانے میں اسے ڈال کر خلط ملط کر دیتے ہیں یہ دیکھنا دیدہ بینا رکھنے کی دلیل ہوتا ہے محض سطح پر تیرنا نہ اعلیٰ نقاد کے منصب کے مطابق ہے نہ دیدہ بینا کی علامت ہے۔

میں کسی معاملہ میں بھی موازنہ حتی الامکان پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کہ

ع
ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

جن کی گفتگو ہو رہی ہے اسی کو ہر زاویہ سے دیکھ کر اظہار خیال کیا جائے۔ لہٰذا یہ بے ادبی کبھی نہیں کروں گا کہ کسی صنف کو کمتر و کسی کو برتر قرار دوں۔ سب کا الگ الگ مزاج ہے اور وہ معتبر و وقیع بھی ہیں۔ یقینی تحقیق و تفتیش کا بھی بڑا مرتبہ ہے اور ضرور نقد و نظر کا بھی ایک مقام ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ فطرت نے کسی میں ہر دو اصناف کی اعلیٰ خصوصیات برتنے کا جوہر ودیعت کیا ہو اور کسی میں محض ایک ہی جوہر بخشا ہو۔ اس لیے اسے اپنے کو آپ پہچان کر قدم آگے بڑھانا چاہیے تاکہ رفتار پر آنچ آئے نہ فرمایا ہوا مستند ہونے سے محروم رہے۔

ایسے لوگ عنقا نہیں ہیں جن کو متوازن و معتدل تسلیم کیا جائے۔ عبدالقادر مرحوم نے ناول کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

"جس طرح قدیم فن جراحی موجودہ ڈاکٹری میں ضم ہو گیا ہے اسی طرح داستان و رومانس کی قدیم خصوصیات ناول میں مدغم ہو گئی ہیں اور جیسے ہم فن ڈاکٹری کو فن جراحی سے مختلف نہیں کہہ سکتے ایسے ہی یہ سمجھ لینا بھی لغو ہوگا کہ ناول و داستان دو جداگانہ چیزیں ہیں۔"

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب مرحوم بھی اسی طرح کی بات کرتے ہیں اور ادبی رجحانات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جن چیزوں کو ہم بالکل آج کی چیز کہتے ہیں ان

کے دھندلے نقوش پہلے بھی غیر منظم صورت میں نظر آجاتے ہیں۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ماضی حال مستقبل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میرے خیال میں اعلیٰ نقاد تاریخ کے ارتباط کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اور اسے نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ

کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے
ماں کا مزاج باپ کے عادات چھوڑ دے

کارل مارکس بھی یہ کہتا ہے کہ:

"کوئی نظام حیات اپنے ماقبل کے نظام حیات کی نفی نہیں کرتا ہے (ب) میں کچھ نہ کچھ الف (ا) کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے"

خلاصہ یہ ہے کہ شعر و ادب کے نقاد کو ماضی سے کٹ کر تمام تر حال ہی میں مبتلا نہ ہو جانا چاہئیے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارباب قلم کا کوئی فلسفۂ حیات نہ ہو یا پسندیدہ سیاسی مدرسہ فکر نہ ہو۔ وہ بھی سماج کا ایک عام عنصر ہیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں اشکچول گھا ہوتے ہیں اور اپنے طور پر جو بہتر سمجھتے ہیں اس کو قبول بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال سے کسی کو یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے اسلامی نقطۂ نگاہ کو اولیت کیوں دی اور میر درد سے یہ شکوہ نہیں ہو سکتا کہ تصوف کے گرویدہ کیوں ہو گئے۔! یہ تو ان کی اپنی پسند کا معاملہ ہے۔ البتہ ان میں جو ہم ایک انفرادیت محسوس کرتے ہیں۔

اس کی تلاش کرنا ضرور مقدم سمجھیں گے اور یہی انفرادیت ان کو لیڈر و مصلح سے الگ کر کے ان کے جوہر نمایاں کرتی ہے۔ جو دانشور اپنی اس خصوصیت کا احترام نہیں کرتے اور اپنے مختلف اوصاف کو فنکارانہ عمل میں گڈمڈ کر دیتے ہیں اسے تنقید نگار کے لیے مترشح کرنا واجبات میں سے ہے۔ اگر فن پارہ تبلیغ و اشاعت کی غمازی کرنے لگے تو دیدہ بینا رکھنے والے کا فرض ہے کہ ان سمات کی طرف اشارا کر دے اور بتائے کہ اس قلم کار نے اپنے ہنر کو کافی نہ سمجھا دوسری صفات کا سہارا لیا اور شرک و بدعت کا مرتکب ہوا۔

جو صاحب فن اپنی انفرادیت برقرار نہیں رکھ پاتے اور فنکار سے زیادہ نیتا بن جاتے ہیں اور جملہ مسائل حیات کو ایک ہی کسوٹی پر کستے ہیں اور اس کے فلسفہ کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں ان کے فنکارانہ عمل کو اگر ایک مقرر کی تقریر کہا جائے تو بے جا کیا ہے۔؟

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر روس میں جو اشتراکیت کا بول بالا ہوا اور جس شدت سے مارکسزم کا پرچار ہمہ گیر صورت میں ہونے لگا اس سے ہم بھی اپنا دامن نہ بچا سکے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں یہاں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی ٹیگور نے بھی دلچسپی لی۔ پریم چند بھی شریک ہوئے اور دوسرے قلم کار بھی آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس لیے یہ انداز فکر بھلا لگا اور زیادہ تر لوگ جذباتی طور پر بھی اس طرف کھنچ گئے۔ لیکن نقاد کے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ترقی پسندی سے مراد کیا ہے۔؟ اگر اپنے عہد کی خام روایت سے بغاوت مراد ہے۔ تو کس حساس و سنجیدہ اہل قلم نے کب نہیں کی۔؟ فارسی شاعری کا تو زیادہ تر حصہ ایسا ہی ہے۔ غالب بھی کچھ کم ترقی پسند نہیں تھے۔

اور اگر مخصوص نظریہ مدرسہ سیاست کی تبلیغ کو ترقی پسندی قرار دیا جاتا ہے تو کیا اس کی ہم نوائی ضروری ہے؟ چونکہ شاعر یا ادیب پروپگنڈسٹ نہیں ہوتے ان کا داخلی وجود کچھ طلب رکھتا ہے وہ اس کی آسودگی کے لیے زبان کھولنے پر مجبور ہوتے ہیں جب ان کو پابند بنا کر ان سے کام لیا جائے گا تو دلوں کو چھونے والی طاقت ان کے رشحات قلم میں باقی بھی رہ سکے گی! نہیں اس پر غور کرنا اور توجہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ نقاد عموماً اس باریکی کو سمجھنے سے قاصر رہے البتہ یہ عرض کروں گا کہ وہ مارکسٹ نقاد کہلانے کے لیے دیدہ و دانستہ نظر انداز کرنے لگے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ پر فرمایا ہے کہ:

"پریم چند کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے ہندوستانی عوام کی زندگی ان کے بنیادی مسائل اور انصاف کے لیے ان کی ہمہ گیر جدوجہد کو اپنے ناولوں اور کہانیوں کا موضوع بنایا۔"

آگے چل کر بھی مضمون میں اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں کہ:

"لڑکپن ہی میں افلاس بدحالی اور پریشانی کے دن گزارنے کی وجہ سے پریم چند وقت سے کچھ پہلے ہی متین اور سنجیدہ ہو گئے تھے۔"

بات حقیقتاً یہی تھی جس پر ہو بحث ہے اور جیسے احول و حالات سے

ایسے گزرنا پڑتا ہے اس کے نقوش پوری شدت سے لاشعور میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں۔ اور وہ دراصل آپ بیتی سناتا ہے لیکن وہ ہو جاتی ہے جگ بیتی۔

ہم چند کو الا ہول ہے بہت سے لوگوں نے چلنا چاہا مگر جو ان کے یہاں صداقت کے جلوے ہیں وہ دوسرے کے یہاں کیونکر نظر آ سکتے ہیں؟ ہر شخص میں جذب و قبول کی صلاحیت بقدر پیمانۂ ظرف ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے ہمونئیت بھی پائی جاتی ہے۔ کامیاب فن پارے کے لیے مقدم ہے کہ اس میں حسن صداقت و حسن شعریت گھل مل گئے ہوں۔ اعلیٰ نقاد کا پہلا فریضہ ہے کہ اس کو محسوس کرے چونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کس نے زمانے کی روح کا احترام کرتے ہوئے ان فنی فنکارانہ عمل کیا اور کس نے ہر دو عالم سے بے نیاز ہو کر اضطراری کیفیت کی غمازی کی۔

یہ شکایت نہیں بلکہ افسوس ہے کہ اتنی ذہنی مشقت بہت کم لوگوں نے کی اور جنبہ داری کا ثبوت دینے میں کوئی کسر اٹھا کر نہ رکھی۔ جب تک تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے نہ دکھائے اس وقت تک اس کا وزن نہ مستحکم ہوتا ہے نہ اہم۔

انقلاب کا نعرہ تو سب نے لگایا۔ جب ترقی پسند مصنفین کی تحریک شباب پر تھی تو ہر چھوٹا بڑا اس سے وابستہ ہونا فخر سمجھتا تھا۔ لیکن کسی نقاد نے کھل کر یہ کہنے کی ہمت نہ کی کہ علی سردار جعفری لیڈر پہلے ہیں شاعر بعد میں۔ جوش اپنے نام کی مناسبت سے تمام تر جوش ہی جوش ہیں اور فیض یا مخدوم کے یہاں جو انقلابی انداز اپنی مدہم لے کے ساتھ ملتا ہے وہ کمیاب ہے۔

احترام و تعلقات کا لحاظ گام گام پر کیا گیا ہے۔ طور مارکسٹ نقاد نے اپنے لوگوں کے تاریک پہلو پر روشنی ڈالنا کفر سمجھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ترقی

پذیر صنف کا جوہر کھلا نہیں ہے۔ اور نہ ان لوگوں کی طرف توجہ فرمائی گئی ہے جو اس کے مستحق تھے۔ اور اگر بہ جبر توجہ کی بھی گئی ہے تو اپنے انداز نظر کو منفرد ثابت کرنے کے لیے ابھی تک توانائی کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ انھیں گھسیٹ کر اپنے معیار پر لے آیا گیا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ نقاد منھ پھٹ و بیباک ہو جائے۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ وہ صاف گوئی سے کام لے اور جو جیسا ہے اس کو اتنا ہی ظاہر کرے۔ کسی کا بھی زمانے کے مطابق چلنا کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ اپنے کو پہچان کر اپنی ذات و لاشعور کی پکار پر عمل کرنا کمال ہے۔ جس نے اپنی ذات کے ساتھ وفاداری نہ برتی وہ دوسروں کی ذات کا وفادار کیا ہو سکتا ہے؟ نقاد کو دیکھنا چاہیے کہ کس صاحب قلم نے طلب شہرت کے لیے محض دوسروں کی مانگ پوری کی ہے اور کس کے جذبات و محسوسات حقیقی و سچے ہیں۔ میکسم گورکی کی معرکۃ الآرا تصنیف (ماں) اسی لیے قابل قدر ہے کہ اس میں جو کچھ ہے وہی مصنف کا اعتقاد و ایمان بھی ہے اس نے زمانے کا ساتھ دینے کے لیے کاوش نہیں کی ہے بلکہ اپنا بوجھ ہلکا کیا ہے۔ اگر وہ یہ فنکارانہ عمل نہ کرتا تو شاید اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ اسی لیے یہ مقدم ہے کہ نقاد تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لیے فنکار کی ذہنی ساخت اور ذہنی عمل کا بھی مطالعہ کرے اس کی انفرادی شخصیت اور مثالی حیثیت کو بھی نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ فنکارانہ عمل کا سرچشمہ کہاں ہے؟ محض خارجی اثرات اور زمانے کے پیچ و خم کو سب کچھ قرار دینا اور اپنے طور پر یہ یقین کر لینا کہ ایسے ماحول میں ایسے ہی ارباب قلم ہو سکتے ہیں۔ چونکہ وہ تمام تر زمانے کی دین ہوتے ہیں اپنے کو محدود کر لینا ہوگا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو ایک ہی ملک ایک ہی زمانے اور ایک ہی زبان کے ادیب و شاعر کے افکار میں تفریق نہ پائی جاتی؟

ملحوظ خاطر رہے کہ اہل فن داخلی یا خارجی محرکات و محسوسات سے جو اخذ کرتے ہیں انھیں ذہن کے خزانے میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور لاشعور کے نہاں خانے میں جب دبی ہوئی خواہشات ان کو گُد گداتی ہیں تو فن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی لیے نقاد کو لاشعور کی دبی ہوئی خواہشات کا حتی الامکان پتہ لگانا بہت ضروری ہے اسی تلاش و تجسس میں کامیاب ہو کر وہ بتا سکتا ہے کہ کس کا فن صداقت سے ہم کنار ہے اور کس کی کوشش مصنوعی ہے؟ ساتھ ہی ساتھ وہ اس کا بھی معقول جواب دے سکتا ہے کہ ہر فرد زمانے کا یکساں طور پر اثر انداز نہ ہونا کیوں ممکن ہے۔؟ ہر شخص بذات خود ایک انجمن ہے اور حساس ارباب قلم تو کچھ اور بھی آگے ہیں۔ سارے ہنگامہ ان کے اپنے اندر برپا ہوتے ہیں اسی لیے آج یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ کسی تحریک سے وابستہ کر کے یا پابندیاں عاید کر کے ہم اچھا ادب ادبا سے نہیں پا سکتے اور اعلیٰ نقاد کے لیے لازم ہے کہ وہ فرد اور اس کے ذہنی عمل میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے۔ یہ ایسی کلید ہے جس سے خزانے کے بند دروازے کھل جا سکتے ہیں۔ اور اتنا کچھ ہاتھ لگتا ہے کہ ہم مالا مال ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کلیم احمد کا انداز نقد ایسا کیوں ہے۔؟ احتشام حسین مرحوم کا رنگ اور ہ نگاہ ایسا کیوں ہے؟ محض علم کی برکت اور کتب بینی کسی کو صحیح مقام نہیں دلا سکتی اس میں من جانب فطرت سوچنے سمجھنے اور گہرائی میں ڈوب کر موتی نکالنے کی بھی صلاحیت ہونی چاہیے۔ اور جن معدودے چند حضرات میں یہ صفت رہی ہے یا ہے ان کی عظمت سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ ذکر تو ان کا ہے جنھوں نے "گاڈ گفٹ" عطیہ خداوندی کو محسوس کرنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنے طور نقد و نظر کو اکتسابی چیز تصور کر کے اپنی سماجی پوزیشن کے باعث پانچویں سواروں میں اپنے کو شمار کرنے لگے اس سے کچھ اور نقصان نہ ہوا ہو اور فائدہ بھی رہا ہو۔ لیکن فن تنقید اور زبان و ادب کا یقینی بے دریغ خسارا ہوا جب تک دیدہ

بینا نہ ہو کھرے کھوٹے کا حکم لگانا فعل عبث ہے۔ اور دیدہ بینا ایک نعمت ہے ایسی نعمت جو ریاض سے نہیں بلکہ اس کی رحمت سے حصہ میں آتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے ؎

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

اپنا محاسبہ اگر ہم آپ کر سکتے تو شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑتی کہ کوئی سر پھرا خود ساختہ نقاد کے پندار کو ٹھیس پہنچانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا لیکن مدتوں انتظار کے بعد جب بڑی حد تک یہ یقین ہو رہا ہے کہ مستقل شیرازہ بندی ہے ایک حلقہ بنا لیا گیا ہے اور ؎

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

کے قاعدے پر عمل ہو رہا ہے تو ضرورت ہے کہ کوئی اٹھ کر آئینہ پیش کر دے اور بصد ادب عرض کرے کہ۔

قبلہ ذرا اپنی صورت اس میں دیکھ لیجیے

ممکن ہے وہ اس جسارت کی بنا پر مصلوب ہو جائے۔ لیکن آنے والی نسل کو ضرور فائدہ پہنچے گا اور تنقیدی دنیا میں ایسا سرمایہ نہیں ملے گا جو مکھی پر مکھی بٹھانے کی مثل صادق کرے۔

شعورِ نظر

تحصیل علم سے بلاشبہ بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اور مطالعہ بھی یقینی راہیں روشن کرتا ہے۔ لیکن بقول اعزاز افضل کلکتوی ؎

دل کے پٹ بند ہیں آگہی کیا کرے
گھر میں روزن نہیں روشنی کیا کرے

جب تک ذہنی دریچے کھلے نہ ہوں۔ ہر گرم و سرد کو باریابی کا شرف نہ بخشا گیا ہو اور حرفِ آخر سمجھ کر کسی ایک نظریہ کو قبول نہ کر لیا گیا ہو اس وقت تک اعلیٰ نقاد بن کر فرض ادا کرنا محال بلکہ ناممکن ہے شعر و ادب میں تنقید کتبِ الہامی یا احکاماتِ الٰہی نہیں۔ جن کے برخلاف سوچنا بھی کفر خیال کیا جائے۔ نگاہوں کا شعور اسی وقت پختہ ہوتا ہے جب ہم منصفانہ طور پر خالی الذہن ہو کر ہر مدرسہ فکر کی سیر کرتے ہیں۔ اور متعصب لوگوں کی طرح اپنے مکتب خیال کو فوقیت و اہمیت دینا واجبات میں داخل نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ مغربی مفکرین یا دنیا کے دیگر ترقی یافتہ علاقوں کا یہ رویہ رہا ہو لیکن ہمارے لیے کوئی ضروری نہیں

ہے کہ آنکھ بند کر کے ان کے نقش قدم پر چلیں۔ ہندستان کی اپنی کچھ صحت مند روایات ہیں اور ہمارا ایک علحدہ و مخصوص مزاج بھی ہے ہم کو لازم ہے کہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھیں اور کسی مقام پر گم نہ ہونے دیں۔ ہمارے لیے کوئی ضروری نہیں ہے کہ صرف اقتصادیات معاشیات یا جنسیات کو زندگی کی اساس تصور کر کے کسی ایک کی شناسائی حاصل کرنا چاہیں۔ علوم و فنون کی کثرت ہمیں اس کے مواقع تو فراہم کرتی ہے کہ ہم سب سے خاطر خواہ طور پر استفادہ کریں اور اپنی ایک الگ راہ بنائیں

لیکن راہ بنانا تو بہت دور کی بات ہے ہمارا حال تو یہ رہا ہے کہ جس ڈگر پر چلے اسی کو سب کچھ سمجھ کر دیگر راستوں کو نہ صرف فراموش کر گئے بلکہ ان کی تحدید میں اپنا وقت ضائع کرنے لگے۔ چناں چہ دنیائے نقد و نظر میں متوازن و متعدل نقاد کم یاب ہیں اور تقریباً عنقا۔

کسی ایک طریقۂ فکر کے ہو رہنا کوتاہ نظری اور تنگ دلی کی علامت ہے اسی ہی کی بدولت دریافت و شناسائی بھی ہماری محدود ہو کر رہ گئی اور مجتہد کے بجائے مقلدین کا غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

بہت سی باتیں دشمن سے بھی ایسی مل جاتی ہیں کہ بڑے کام کی ہوتی ہیں اور ایک تلاش علم کے دیوانے کے یہاں دوست و دشمن کی کیا تمیز وہ تو نا سمجھ ہے تشنہ ہے جہاں سے کبھی سیراب ہوتا ہے اور جو بھی کسی قدر آسودگی بخشتا ہے اس کی طرف بڑھتا ہے اور شدت سے بڑھتا ہے۔ ایک اعلیٰ نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے۔ اور اپنی آخری منزل تک ہمت نہ ہارے۔ اس کے لیے یہ پوری دنیا ایک مدرسہ ہے اور وہ ہمیشہ طالب علم ہے اسے نہ شرمانے کی ضرورت ہے نہ یہ خیال کرنے کی کہ اب تک جس کو درجہ اولیت دیتے رہے آج اس کے مقابلہ میں کسی اور کو بھی

تسلیم کرلیں تو لوگ کیا کہیں گے ؟ لوگ جو جی چاہے کہیں ۔ اپنی معلومات و بالغ نظری کے باعث کل کے مقابلہ میں آج کوئی مختلف گفتگو کرنا یا کسی نظریہ کو تسلیم کرنا قطعاً ذہنی ہے نہ توہین ۔ جس قدر نگاہوں میں شعور آتا جائے گا اور ماہیت و اصلیت سمجھنے و جاننے کی صلاحیت پیدا ہوتی جائے گی اسی قدر ہمارے اندر تبدیلیاں بھی ہوں گی اور انقلاب بھی آئے گا ۔ اپنی جگہ پر پہاڑ بنے اٹل رہنا کوئی خوبی تو نہیں ہے ممکن ہے یہ عصبیت ہو جسے ہم خود نہ محسوس کر رہے ہوں ۔ اور عصبیت سے نجات حاصل کرنا بلندی و عظمت کی نشانی ہے ۔ افلاطون ، برکلے ، ہیگل وغیرہ کی عینیت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کسی اعلیٰ ترقوت کے ذہن میں جاگزیں ہے ۔ اول تو حقیقت کا کوئی وجود ہی نہیں ۔ اور اگر ہے تو وہ انسانی ذہن کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے ۔ مارکسی اور دوسرے مادیت پرست اسکے برعکس خارجی دنیا ہی کو حقیقی مانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ فکر و خیال سے آزاد اپنا ایک علیحدہ و مستقل وجود رکھتی ہے مارکس کے نزدیک حقیقت کو پانے کا واحد ذریعہ جدلیاتی مادیت ہے ۔ ادب میں سماجی حقیقت نگاری اور ترقی پسندی اسی نظریہ کی پروردہ ہے ۔ بقول دیوبند آکیر :

اشتراکی حقیقت نگاری میں اس مقصد کے حصول کے لیے حقیقت کو سماج کے ارتقائی عمل کے نام پر توڑ مروڑ بھی دیا جاتا ہے ادب کی اپنی کوئی حیثیت نہیں رہتی بلکہ وہ سماج اور سیاست کے بارے میں ایک خصوصی نظریہ اور یا رہا مخصوص مروجہ پالیسی کا آلۂ کار و تشہیر کرنے والا بن جاتا ہے ۔ وارن اور ویلک نے اسی نقطہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسا اعلیٰ ادب موجود ہے جس کا سماجی تعلق بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے

ہے۔ سماجی ادب۔ ادب کی محض ایک قسم ہے ادب کے نظریہ
کا یہ مرکزی موضوع نہیں۔"

اس کے برعکس فرائڈ نے بتایا کہ زندگی کی اساسی شہ شخصی قوت ہے
ہماری شخصیت اور ہمارے بیشتر میلانات لاشعور کے پروردہ ہیں ہم تلاش
مسرت کے اصول کے تحت اپنی خواہشات اور جبلتوں کی تسکین چاہتے
ہیں سماجی اور خارجی حقائق اس مسرت کو جس کا سرچشمہ لاشعور ہے۔
پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچنے دیتے جس کے باعث ذہنی کشمکش پیدا ہوتی
ہے ادیب حقیقت سے منھ موڑ کر تخیلی دنیا میں پناہ لیتا ہے وہ اپنی لاشعوری
اور دبی ہوئی جنسی خواہشات کو تسکین کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔

اب شعور کی بلندی یہ ہے کہ نقاد اپنے طور پر تجزیہ کرے اور شعر و ادب
کی قدر و قیمت مقرر کرنے میں جو انداز فکر اسے صحیح و مناسب معلوم ہو اسے
کام میں لاتے ہوئے دوسرے کو بھی نظر انداز نہ کرے بلکہ حسب ضرورت
اس سے بھی رجوع کرے۔ یہی جامعیت اس کے وقار کو مستحکم کرتی ہے اور اس
کے مقام کو ارفع اعلیٰ بناتی ہے وہ کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہوتا نہ کسی کی تردید و تائید
اس کا کام ہوتا ہے۔ بلکہ ایک غواص کی طرح تہ میں ڈوب کر موتی نکال لانے ہی
میں اس کی بلندی و برتری پوشیدہ ہوتی ہے۔ ہم نے اس خصوصیت کا کس حد تک
احترام کیا؟ اس کا فیصلہ ہمیں خود کرنا چاہیۓ۔

کوئی بھی نظریہ نہ حرف آخر قرار دیا جا سکتا ہے نہ یہ بتایا جا سکتا
ہے کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہے۔ جو لوگ اس طرح پر خیال کرتے
ہیں وہ حقیقتاً نقاد کی فطری صلاحیتوں کے دشمن ہیں یا اسے محدود کر دینا
چاہتے ہیں۔ انسانی فطرت بڑی پر پیچ اور معمہ ہے۔ اس کی گہرائی تک

رسائی آسان کام نہیں ہے اور جب تک ہم ڈوب کر تلاش نہ کریں ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگ سکتا ہے۔

یہی حادثہ تنقیدی دنیا کا انتہائی المناک پہلو ہے۔ اور معدودے چند کے علاوہ صحیح منصب کا لحاظ عام طور پر نہیں کیا جاسکا ہے۔ کہنے کو تو بکثرت نقاد ہیں لیکن ان کا طائر فکر حصار کھینچ کر اپنی طاقت پرواز دکھاتا ہے۔ حسرت موہانی پر اگر گفتگو ہو رہی ہے تو کم و بیش سب ایک ہی بات کہہ رہے ہیں مولانا محمد علی جوہر پر اظہار خیال کیا جارہا ہے تو غیر معمولی یکسانیت ہے۔ آخر ایسا کیوں۔؟ ایک نقاد کسی حکمراں سیاسی پارٹی کا نمائندہ یا وزیر تو نہیں ہوتا جو کچھ رٹے رٹائے جملے یاد کر کے مختلف تقریبات میں ادا کیا کرتا ہے۔ اس کی حیثیت نہ صرف مختلف ہوتی ہے بلکہ منفرد بھی۔ اس کی اڑان حد نظر سے آگے ہے اور اس سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ اپنے شعور نظر کی بنا پر ہمیں کچھ نئی راہیں دکھائے گا اگر ہماری توقعات کو بٹھیس پہنچے تو کیا ہم مایوس ہونے کے بجائے اسے جگانے کا بھی فرض ادا نہیں کر سکتے۔ یہ تو ہماری محبت اور اس کے ساتھ عقیدت کا ثبوت نہیں ہے۔ اسی لیے خود اسے یہ اس کے ماننے والوں کا حق ہونا چاہیے اور خلوص نیت پر یقین کرتے ہوئے کان دھرنا چاہیے۔

دیدہ بینا نہ صرف پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے نہ صحبت یافتہ ہونے سے یہ خدائی دین۔ ہے اور ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری سماجی حیثیت مستحکم ہے اور ہم اس قابل ہیں کہ جس کے لیے جو حکم لگا دیں گے وہ حرف آخر مان لیا جائے گا لہٰذا

لکچر یا تقریر میں ان نا اہلوں کو سر آنکھوں پر جگہ دے رہے ہیں جن میں نہ نقاد بننے کے عنصر ہیں۔ نہ محقق بننے کا مادہ

کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنی برادری کا پاس کیا جاتا ہے کوئی لکچرر ہے پروفیسر ہے یا اپنے حلقۂ بگوشوں میں ہے تو اس کی کمزوری کو کیسے طشت ازبام کریں؟ کہنا ہی پڑتا ہے کہ دور حاضر میں کچھ لوگ امید افزا کام انجام دے رہے ہیں۔ اور ماضی قریب سے حال کا گہرا رشتہ ہے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ صورت حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ نہ تنقید الفاظ کی بازیگری ہے۔ نہ انشاء پردازی کی کوئی بدلی ہوئی شکل ہے۔

یہ بالکل الگ میدان ہے۔ یہاں عمدہ بول لینا اور مجمع کو اپنی طرف مخاطب کر لینا کوئی ہنر نہیں ہے۔ پڑھنے والا صفحہ قرطاس پر آنے کے بعد ایک ایک لفظ کو پوری توجہ سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ اسے حشو وزوائد کا خیال رہتا ہے وہ تنقیدی کاوشوں میں مواد کی تلاش کرتا ہے ترشے ہوئے جملوں کی نہیں۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی تحریر خشک ہوتی تھی برخلاف اس کے آل احمد سرور کے یہاں چاشنی بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے گا کہ وہ مزدور جو بڑی حد تک ان پڑھ کہلاتے ہیں چندہ کر کے ہر نئی کتاب احتشام صاحب کی خریدتے تھے اور دوسروں سے پڑھ کر اس لیے سنتے تھے کہ زندگی کے مسائل سے ان کو واقفیت ہو سکے اور وہ جان جائیں کہ حیات مستعار کے اس عہد میں کیا تقاضہ ہیں۔

اب اگر ان کی کمی کو پورا کرنے والا ہم اپنے پسندیدہ لوگوں کو سمجھنے لگیں تو تو یہ ہماری سراسر کور چشمی یا جنبہ داری کہلائے گی۔ چہ نسبت خاک راہ

بہ عالم پاک بہت تو شعر و شاعری کا جملہ اوزان سے بھی واقفیت نہیں رکھتے وہ
مراثی انیس پر محققانہ کام کرکے اپنے کو جو کچھ بھی سمجھیں لیکن جاننے والے
بخوبی جانتے ہیں کہ ایسا شخص کیا کسی کی شاعری شناسی کا دعویدار ہو سکتا ہے۔
جس کو یہی نہیں معلوم ہے کہ کون مصرع کس بحر میں ہے۔؟ موزوں ہے یا
ناموزوں ہے نیاز فتحپوری، مالک رام قاضی عبدالودود وغیرہ وغیرہ بلاشبہ
مستند محقق ہیں اور بڑی عرق ریزی کی اور خوب خوب چھان بین فرمائی ہے
ان کی تحقیق محض مطالعہ تک محدود نہیں ہے اپنی بھی صلاحیتوں کا دخل ہے
تنقیدی مزاج بھی ہے اور اسی لیے ان کا فرمایا ہوا ہمیں مستند معلوم ہوتا ہے
جو لوگ ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے کو بھی پانچویں سواروں میں گننے لگے ہیں
ایمان سے بتائیں کہ ان کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ اور کہاں کہاں جم کر انھوں
نے تلاش و تجسس کے لیے محنت کی ہے؟ آج تک وہ فرقہ واریت کے خول سے
باہر نہیں آسکے ہیں۔ ہر مسئلہ کو شیعہ سنی کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں اور لکھنؤ
کے ہم مذہب پبلشر کو قربانی کا بکرا بنائے ہوئے ہیں۔ اگر ان باتوں کو
ذاتی سمجھ کر ٹال بھی دیا جائے تو ان حقائق پر کیسے پردہ ڈالا جا سکتا ہے جو
طبع ہو کر ہمارے سامنے آچکے ہیں۔؟ ان کے مداحوں کو بڑا ناز ہے کہ۔
"انیس پر" ان کا وہ کارنامہ ہے جو ان کو رہتی دنیا تک زندہ رکھے گا؟
لیکن اس انمول کتاب میں تصاویر تو ضرور بکثرت ہیں مراثی کے سلسلے میں جو
کچھ لکھا گیا ہے وہ توجہ طلب ہے اور اغلاط سے بھرپور۔ مولانا عرشی مرحوم
نے ایک انٹرویو میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ

"چند الفاظ نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ثابت
ہوں گے ان کی رہبری کے لیے بھی کچھ

فرما دیں ہے۔ کہا تھا کہ " وہ اس بات کی بھر پور کوشش کریں گے جیسے ان کے اسلاف نے کوشش کر کے جو کچھ پہلے سے حاصل کیا تھا اس کو ترقی دیکر آگے بڑھایا تھا اسی طریقہ سے آج کی دنیا سے ہر وہ چیز حاصل کریں جو انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لیے ضروری ہے اور جس شکل میں حاصل کریں اس شکل سے زیادہ بہتر فارم اس کو دے کر اگلی نسل کے لیے چھوڑ جائیں۔"

آگے چل کر مولانا عرشی مرحوم کا ارشاد ہے:

" انھیں جیسے لوگوں کو سامنے رکھنا چاہیے جن کے پاس کسی قسم کی اکیڈمک کوالی فیکشن نہیں تھی صرف پرانے لوگوں اور نئے لوگوں کے کاموں کو دیکھ دیکھ کے انھوں نے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کی کہ وہ کچھ علمی خدمت کرسکیں علم کسی قسم کی سند میں بند نہیں ہوتا بلکہ علم اصل میں انسان کے دماغ اور انسان کے اس جذبۂ عمل میں محصور ہوتا ہے جس نے دنیا میں لوگوں سے بڑے بڑے کام کرائے ہیں۔"

اب ایسے لوگوں کا تجربہ کیجیے جو سب کچھ اپنے کو سمجھتے اور اپنے اسلاف سے کسب فیض کرنے کے بجائے انھیں پر منھ آتے ہیں بھلا وہ کیا ماضی کی صحت مند روایتوں کو دہرائیں گے؟ اور آنے والی نسلوں کے

یے کوئی سلیقہ کا کام انجام دے سکیں گے۔؟ ایسے اشخاص کا دل بڑھانا یا ایسی گراں قدر گفتگو میں ان کا نام لینا سچ پوچھئے تو اپنی توہین ہے۔ اور اولیٰ یہی ہے کہ خاموشی سے ان کو نظر انداز کیا جائے اور ان کی بدولت حال کو گرانقدر نہ کہا جائے۔

کم از کم وہ لوگ جو سمجھ کر پڑھ لینے کے نتیجہ میں اصول و آئین اپنی زبان میں منتقل کر رہے ہیں لائق پذیرائی ہیں۔ اضافہ نہ سہی یہی بہت ہے کہ دوسری زبانوں میں جسقدر اب تک کام ہو سکا ہے اس کو اپنی زبان میں پیش کر رہے ہیں اور دامن کو وسیع کر رہے ہیں۔ یہ تو محنت و لگن سے اس طرف بھی متوجہ نہیں ہیں ان کی تو بس یہ کوشش ہے کہ کسی طرح دنیا میں ہم حال کے بہترین محقق اعلیٰ درجہ کے نقاد اور ممتاز لکھنے والوں میں شمار کئے جانے لگیں۔

یہ صحیح ہے کہ زمانہ بہت کچھ بدل چکا ہے اب وہ دور نہیں رہا کہ ہماری زبان کے تمام لکھنے والے بٹیر بازی اور پتنگ بازی کے قاعدہ پر فن کارانہ عمل کریں اور پیٹ پالنے کے لیے کوئی اور دھندہ اختیار کریں اس مشغلہ سے بھی ان کو خاصہ معاوضہ ملتا ہے اور وہ اطمینان کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کے پیش نظر محض روپیہ کمانا نہ ہو بلکہ کچھ متانت و سنجیدگی کے ساتھ ٹھوس کام کرنا بھی ہو۔ دنیا اتنی کور چشم نہیں رہی ہے کہ محنت کرنے والے کو بقدر نمک ہی سہی اس کی محنت کا معاوضہ نہ دے۔ نہ یہ وہ زمانہ ہے کہ اہل فن کو قصائد درباروں میں سنانے پڑیں۔ اہل ثروت کی نگاہ کرم ہو تو ان پر ادھ وہ لطبور خیرات یا عطیہ کے کچھ پائیں۔ بلکہ ان کا فن خراج تحسین وصول

کرتا ہے اور ان کو جو کچھ ملتا ہے وہ ان کی خدمت زبان و ادب کے صلہ میں۔
فراق نے اگر زرِ کثیر پایا تو کچھ کر کے دکھایا بھی۔ پہلے آپ کیجئے پھر طلب کیجئے
یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دینا سے بھلے کی
تمنا کی جائے۔؟

نقاد کا درجہ بہت افضل ہوتا ہے اس کا لکھا ہوا ایک ایک حرف
آئندہ نسل کے لیے مشعلِ راہ بھی بن سکتا ہے اور قعرِ مزلت میں بھی گرا
سکتا ہے۔ وہ آپ کو اچھے برے میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ اس کی حیثیت
محض شاعر و ادیب کی نہیں ہوتی۔ جن کی گفتگو معاصرانہ چشمک پر بھی محمول
کی جاسکتی ہے۔ اس کو متوازن غیر جانب دار اور محتاط ہونے کی اشد
ضرورت ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ میدان بڑا سنگلاخ ہے۔ تلوے
لہولہان ہو جاتے ہیں۔ خارِ مغیلاں گام گام پر ملتے ہیں اور خودی پر ہر لحہ
آنچ آتی ہے۔ جاہل بھی کہا جاتا ہے۔ بے خبر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا
ہے اور دوست کم دشمن زیادہ بنتے ہیں۔ غالبؔ کا یہ مصرع حرف بحرف
صادق آتا ہے کہ ع

"جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں"

یہ راہ تو جان و دل کے عزیز رکھنے والوں کو راس ہی نہیں آتی ہے
سچائی بڑی کڑوی اور کسیلی ہوتی ہے۔ آپ سچ بولیں گے تو ضرور زبان کو
کترنے والوں کا ہجوم پیچھے لگ جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ آپ
مطعون ہو جائیں کسی محفل میں آپ کو نہ بلایا جائے اور کوئی منہ نہ لگائے۔
ایک سچے اور صحیح نقاد کو سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور جو اپنے خیال
میں خاصہ تجربے کے بعد وہ حق سمجھتا ہے اس کے اعلان سے باز نہیں آتا

ہے۔ یہ جرأت یہ ہمت اور یہ صلاحیت اگر عنقا نہیں تو کمیاب ضرور ہے
میں دور دراز کی تو گفتگو کر نہیں سکتا چند اغل بغل کے لوگوں کا ضرور جائزہ
لیتا رہا ہوں اور بغیر تکلف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ تنقیدی صلاحیت رکھتے ہیں
اور آہستہ آہستہ ابھر رہے ہیں۔ مثلاً

ڈاکٹر انیس اشفاق۔ دوران تعلیم میں چناؤ مہم کے زمانے میں
اسٹیج پر آئے اور بہت کمسنی سے حق گوئی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔
انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور علاوہ اپنے گراں قدر مقالہ کے چھوٹے
بڑے مضامین بھی لکھتے رہے۔ جن کو اکثر و بیشتر پڑھنے کے بعد ایسا محسوس
ہوا کہ صادق القول لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ کوئی مبتدی سمجھ
کر ان کو صحیح مقام نہ دے یا روش عام سے ہٹ کر اظہار خیال کرنے والا
کہے لیکن وہ گھما پھرا کر بات نہیں کرتے اور شعر و ادب کے معاملہ میں کسی
سمجھوتے اور مفاہمت کے قائل نہیں ہیں۔

یہی حال مسٹر شاہ نواز قریشی کا بھی ہے ان دنوں اتر پردیش کے سرکاری
ماہنامہ نیا دور کے جوائنٹ ایڈیٹر ہیں میرا ان کا ساتھ بہت پرانا ہے میں
نے ان کو ہر طرح ٹھونک بجا کر دیکھا ہے اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح
پایا ہے۔ ان کی اپنی ایک مثبت رائے ہے، پڑھتے ہیں تو جذب بھی کرتے
ہیں۔ ان کے قد تو ضرور چھوٹے ہیں لیکن دل بڑے ہیں۔ یہ ان لوگوں
میں ہیں جو زبان حال سے کہتے رہتے ہیں ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

انھوں نے زیادہ نہیں لکھا ہے شاید جم کر یہ کام کرنے کے ابھی عادی

نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن جس قدر بھی جس کو سمجھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی نسل بیدار و بالغ نظر ہے۔ ان کی طرح اور نہ جانے کتنے نوجوان صفحہ کائنات پر ابھر رہے ہیں اور اپنی ذہانت سے آگے آنے والوں کے لیے مواد فراہم کر رہے ہیں مگر ان کا ذکر خیر کچھ تو اس بنا پر نہیں کہ گھس پٹیوں کی طرح۔ ہر جگہ ماحول آفرینی نہیں کرتے بغیر تعارف ہر کس و ناکس سے ملتے نہیں۔ اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کے شوقین ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جن کو اس کا موقعہ ہے کہ ماضی و حال میں صحت مند رابطہ بتاتے ہوئے چند اسمائے گرامی کی تکرار فرمائیں۔ وہ ہنوز انھیں کا دم بھر رہے ہیں جو ان کے سامنے ہیں۔ حالانکہ یہ محنت سے جی چرانا تلاش و تجسس سے باز آنا اور دیانت داری سے اپنے فرائض کو نہ محسوس کرنا کہلائے گا اور مستقبل کے انصاف پسندوں کی بات تو در کنار حال کے منصف مزاج حضرات کو بھی چونکا دے گا۔ پھر بھی یہ روش عام ہے اور پسندیدہ۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ لاشعوری طور پر ہمارے ذہن میں مغربی علوم کی ترقی کے باوجود پرانی باتیں چکر کاٹا کرتی ہیں۔ اور ہم اگر بڑی شاعر جاسر سے لے کر میر و غالب تک کے یہاں تنقیدی شعور کی تلاش کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ تمام بزرگ نقاد تھے۔ حالانکہ ان کا مذاق نقد و نظر اور تھا اور جسے ہم لوگ تنقیدی معیار قرار دیتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ ارباب فن کا شاعرانہ مسلک جداگانہ ہے کوئی مضامین کی تکرار کو عیب سمجھتا ہے کسی کے یہاں طرحی غزلوں کا ہونا کافی ہے کوئی فصاحت و بلاغت پر سارا زور خرچ کرتا ہے کوئی مواد کو اہمیت دیتا ہے الغرض اپنا اپنا مذاق شعر و ادب ہے لیکن ہم اسے تنقید سے تعبیر نہیں کریں گے۔

تنقید اور ہی چیز ہے۔ کوئی صاحب فن کیا رجحان رکھتا ہے یہ اس کا اپنا معاملہ ہے نقاد تو یہ دیکھے گا کہ اس نے اپنے دائرہ میں محصور ہوتے ہوئے کہاں تک شعر و ادب کی ایسی تخلیق کی ہے جو آپ بیتی ہونے کے باوجود جگ بیتی محسوس ہوتی ہے اور اسلوب میں وہ تنوع برتتا ہے کہ ہزاروں منھ کی انگلی ہوئی باتیں نئی معلوم ہو رہی ہیں۔ اسی بنا پر ہمارے لیے یہ بھی مقدم ہو جاتا ہے کہ ہم کوشش کریں اور ڈھونڈ کر ایسے در نایاب سامنے رکھیں جن تک اہل نظر کی رسائی ہنوز نہیں ہو سکی ہے۔ سامنے کی چیزوں کو دیکھنا اور جن پر سب لکھ رہے ہیں ان پر قلم اٹھانا ہمارے صحیح منصب کو اجاگر نہیں کرتا۔ بلکہ ہماری بڑائی اسی میں پوشیدہ ہے کہ ہم مکھی پر مکھی بٹھانے سے حتی الامکان گریز کریں اور گلستان نقد و نظر میں کچھ ایسے گل بوٹے کھلائیں کہ آنے والے زمانے کی روح مشام جان سے معطر ہو جائے۔

تنقیدی کتب کا انبار بلا ضرورت لگانا حسن نہیں۔ یہ کاوشیں آنے والی نسلوں کو چراغ راہ دکھانے کا کام کر سکتی ہیں۔ اسی لیے ان کی اہمیت بھی ہے اور قدر بھی۔ اگر ہم نے دنیا کو کچھ نہیں دیا اور صرف انہی لوگوں پر سارا زور خرچ کیا جن پر دوسرے بھی کرتے رہیں یا کر رہے ہیں تو اوراق کو سیاہ کرنے سے حاصل کیا ہے؟ تائید بری چیز نہیں۔ لیکن ایک دو تین چار تک جائز ہے یہ کیا ستم ہے کہ دفتر کے دفتر تیار کئے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آنے والا عہد جو کسی قدر ہم سے آگے ہی ہوگا وہ یہ رائے قائم کرنے میں کیوں نہ حق بجانب قرار دیا جائے گا کہ ہماری نگاہیں تنگ تھیں ہم نے کچھ اشخاص کو تو انتخاب کر لیا تھا بقیہ کو یا تو نظر انداز کر دیا تھا یا محنت و مشقت کا بار اٹھانا پسند نہیں کیا تھا۔

نقاد بننا بڑی عمدہ بات ہے ہمارے ترقی یافتہ معاشرے کا تقاضہ بھی یہی ہے لیکن اس منصب کے لیے کون اہل ہے اور کون نااہل اس کو اپنے طور پر سمجھ لینا ضروری ہے۔ ایک ہی شخص مختلف اوصاف کا آئینہ دار ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تنقید کرنے والا مقرر بھی بلا کا ہو۔ سجاد ظہیر مرحوم کی ناقدانہ صلاحیتیں عالم آشکارا ہیں لیکن وہ تقریر کرنے میں اتنے مشاق نہیں تھے تو اس سے کوئی حرف نہیں آتا۔ بڑائی کی یہ نشانی نہیں ہے کہ ہر طرف ہاتھ پیر مارے جائیں بلکہ بلندی کی علامت یہ ہے کہ جو ہم نہیں جانتے ہیں اس کے بارے میں صفائی سے کہہ دیں کہ ہمیں واقفیت نہیں ہے۔ مختصر سی عمر میں ایک شخص تمام اشیاء پر قادر نہیں ہو سکتا لہذا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہر پڑھا لکھا تنقیدی شعور کا بھی حامل ہو اور دیدہ بینا بھی رکھتے ہو۔ حال ہی میں ایک کتابچہ میری نظر سے گزرا اس میں رقم ہے کہ

> بہت سے مراثی دوسرے حضرات کے
> میر انیس کے غیر مطبوعہ کلام کے نام
> سے شامل کر دیا تھا مگر میں بہت شکر
> گزار ہوں جناب سید محمد رشید صاحب اور
> سید علی احمد دانش آل انیس کا جن لوگوں
> نے اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی دکھائی
> اور غلطیوں کی نشاندہی کرائی وہ مراثی نکالے گئے
> دوسرے شامل کئے گئے جو میر انیس ہی
> کے تھے۔

آگے چل کر تحریر ہے:

اصل میں اس کتاب کے مرتب جناب سید محمد رشید صاحب
اور سید علی احمد صاحب ہیں۔

ان ہی حضرت کے ادھ کا دنامے ملاحظہ فرمائیے۔ خود اپنے مضمون میں
تحریر فرماتے ہیں کہ پروفیسر شبیہ الحسن کے سربراہ شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی
کے آنے سے میری زندگی چٹخ گئی۔

دوسری جگہ رقم طراز ہیں کہ

ایک مظلوم حیدری کے حلق پر سرور ڈور عابدی
نے خنجر پھیر دیا۔

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

سرور کے دل میں یہ خوف ہے کہ اگر ہم یونیورسٹی
میں کوئی گوشہ پائیں گے تو ان کی ڈاکٹری ہاتھ
سے نکل جائے گی اور لوگ اس لیے مجھ سے
جلتے ہیں کہ میں ان کی قلعی کھولتا ہوں۔

تیسری جگہ لکھتے ہیں کہ

مجھے اس کاتب "حرامی" نے بے حد پریشان
کیا جو نقطہ نہیں ڈالتا ہے آپ نے بڑی غلطی
کی کہ اس حرام خور سے کتابت کروادی حسن عباس حسین صاحب الوی
کی کتابت بھی ایسی ہی ہے یعنی دونوں بیہودہ
کاتبوں نے سطروں کی سطریں غائب کر دی
ہیں۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ اکثر کاتب حضرات غلطیاں کرتے ہیں لیکن وہ

لیکن وہ شریف طبقہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں
ان میں سے کسی کو بھی ایک ادیب اور معلم
تہذیب کا بیدھڑک موٹی سی گالی دیدینا
شایان شان نہیں ہے"

ایک اور خط میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

"یگانہ چنگیزی پر مجھے بہت سا مواد ملا ہے"

بھلا یگانہ چنگیزی سے اُن محترم کو کیا واسطہ؟ مالک رام اور کچھ مستند لوگوں نے جو کچھ کلیق کے بارے میں تحریر کیا ہے اور جہاں جہاں سے ان کو مطبوعہ مواد ملا ہوگا وہاں تک ان کی رسائی ہوگی۔ انھیں کیا معلوم کہ پٹنہ میں یگانہ جب یاسؔ تھے کیا عالم تھا لکھنؤ پہنچنے پر ان کی کیسی گزری بنّا صاحب موّج وغیرہ نے کس حد تک رہنمائی کی اور مغل پورہ (پٹنہ کا ایک قدیم شرفاء کا محلہ) جہاں میرا بھی مکان تھا۔ اور ان کا بھی مولد و مسکن کس آزادی اور زندہ دلی سے وہ رہا کرتے تھے۔ میرے بزرگوں نے ان کا وہ دور دیکھا ہے جو باغ و بہار کہا جاسکتا ہے۔ پھر موصوف کو ان کے نسبتی بھائی بنّے صاحب مرحوم سے وہ قربت کہاں رہی کہ ان پر صحیح روشنی ڈال سکیں۔؟ اور ایسے مواد فراہم کرسکیں جو آخر وقت کا ان کا سرمایہ ہے۔؟

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"سکریٹری انجمن ایڈ کو میرے ساتھ ہمدردی ہو رہی ہے؟
میرے قتل سے ان کو انتہائی دکھ ہوا ہے ان کا فقرہ

ہے کہ اس سے تو بہتر ہوتا کہ پان کی دوکان کھولتے!
انھوں نے مارچ سے آج تک "ہماری زبان" میں میرے
آٹھ مضامین شائع کیے ہیں ہر ہفتہ ایک مضمون
میرا چھاپتے ہیں میرے مضامین چھاپ کر انھوں
نے یہ رائے قائم کی ہے کہ "امتیاز علی عرشی اور
قاضی عبدالودود صاحب کے بعد اردو تحقیق میں
میرا نام آتا ہے"۔

اگر کوئی شریف النفس آدمی دلجوئی کی خاطر اپنے جریدے میں مسلسل کسی کو جگہ دے اور بڑوں کے بعد ان کو بھی لکھے کہ آپ کا نام نامی سرفہرست ہے تو اسے سند خیال کرکے طشت ازبام نہ کرنا چاہیے اور ضروری ہے کہ اپنی شناسائی کی بھی صلاحیت پیدا کی جائے ——
شرافت و انسانیت کے ماتحت کوئی کتنا ہی کندہ ناتراش اور لغو و مہمل آدمی کو بلند و بالا قرار دے کبھی وہ اپنی خود پرستی سے باز نہیں آسکتا۔ جہاں ایسے اشخاص کا اجتماع ہو جو ذرا سی بات کسی بڑے کے منہ کی اچک لیتے ہیں وہاں تو اور زیادہ ذمہ دار حضرات کو محتاط رہنا چاہیے۔ اور لب کھولنے سے پہلے یہ دیکھنا اور سوچ لینا مقدم ہے کہ کون کیا ہے؟ جس نقاد و محقق نے ایک عمر گزار دینے کے بعد بھی فرقہ واریت سے دامن نہ چھڑایا ہو جو ہر مسئلہ کو شیعہ سنی عینک لگا کر دیکھتا ہو وہ بھلا غیر جانب داری سے کیا سلیقہ کا کام کر سکتا ہے۔؟ جس کو آج تک بھی علم نہیں ہے کہ ڈاکٹر اقبال جس مقدمہ کے سلسلے میں آرہ تشریف لے گئے تھے وہ وہاں کی عدالت میں تو تھا مگر اہم برادران نے چھوٹا سا شہر سمجھ کر اپنے دولت کدے

پر ان کو مہمان رکھا تھا اور بذریعہ
کار پٹنہ لائے تھے
جس کے راوی جسٹس جعفر امام
جسٹس نقی امام اور جسٹس فضل علی
مرحوم و مغفور ہیں۔
اوّلذکر دونوں حضرات سر علی امام
کے بیٹے تھے اور آخر الذکر
بزرگ مسٹر حسن امام کے سمدھی
تھے۔ اور یہ بات اس لیے قابل یقین
اور قرین قیاس ہے کہ آج کے
اعتبار سے اُس وقت آرہ زیادہ
غیر آباد اور چھوٹا سا شہر تھا۔ ڈاکٹر
اقبال جیسی ہستی کے لیے لائق آسائش
نہ تھا۔ نیز یہ کہ پٹنہ کے لوگ
ایسے گئے گزرے نہیں تھے کہ ایک
جلیل القدر ہستی کو سر آنکھوں
پر جگہ نہ دیں اور اپنی دیرینہ
مہمان نوازی کا ثبوت فراہم نہ
کریں۔

تنقید میں ضرورت اس کی بھی ہوتی
ہے کہ اپنی عقل و فراست پر
ایمان لایا جائے اور ضرورت
کبھی سخن پر عمل نہ کیا جائے
اب ان کی بہت سی باتیں اپنی
دانش وری سے بھی سطے کرتا
چھوڑتے ہیں اور دیکھا جاتا
ہے کہ اس طرح کے امکانات تھے
بھی یا نہیں۔ یہی چیز اسے ایک محقق
سے الگ کرتی ہے۔

اب آپ آغا حشر ہی کا معاملہ لے لیجیے
وہ بہت کمسنی میں تھیٹر کے گروہ میں جڑ کر
گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

میں نے بھی جب ان ہی کی طرح کمسنی میں عملی دنیا میں قدم
رکھا تو سب سے پہلے ان کے آخری دور میں ان کا نقل نویس رہا اور
ان کو بہت قریب سے دیکھنے و سمجھنے کا موقع ملا

وہ کبھی ڈرامہ خود نہیں لکھتے تھے۔ ان کے اندر جو تمثیل نگار چھپا
بیٹھا تھا وہ ان کو بے چین کرتا تھا اور ریشمی لنگی دو بالی وار بنیان
پہن کر وہ بولتے تھے بسا اوقات ٹہلنے لگتے تھے اور جو لوگ اس
کام پر مقرر تھے وہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قلمبند کرتے

جاتے تھے۔ آغا صاحب پر ایک کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اور ان کی اس کیفیت کا ساتھ دینا بسا اوقات لکھنے والوں کے بس سے باہر ہو جاتا تھا۔ اتنی تیز رفتاری۔ جذبات کی شدت۔ اور بہاؤ ہوتا تھا جسے گرفت میں لانا محال ہو جاتا تھا۔ پھر ایسا ہوتا تھا کہ وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاتے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے تھکن سی محسوس کرتے تھے ماتھے پر پسینہ جگمگانے لگتا تھا۔ کیفیت تخلیق طاری ہونے کے بعد وہ اپنے کو بالکل بھول جاتے تھے۔ بعد میں اس کا احساس ہوتا تھا کہ کوئی کارنمایاں انجام دے کر چور چور ہو گئے ہیں۔ جب طبیعت ٹھہرتی تھی تو حکم فرماتے تھے:

"جو کچھ میں نے لکھوایا ہے پڑھ کر سناؤ"۔ یہ منزل بھی کوئی آسان نہیں تھی۔ لفظ لفظ کی روح کو سمجھ کر ادا کرنا قیامت سے کم نہیں ہوتا تھا؟ مگر اسے فنکار کے خلوص کی برکت کہیے یا ڈرامائی عناصر کی فراوانی کہ جو لوگ اداکار نہیں تھے وہ بھی غیر محسوس طور پر اداکاری کا مظاہرہ کرتے تھے اور بڑی حد تک سلیقہ سے ان کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ رد و بدل کی شاید ہی کبھی نوبت آتی ہو ان کا فرمایا ہوا حرف آخر ہوتا تھا۔ اور کہا بھی کرتے تھے۔

"فنکارانہ عمل اضطراری ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ وحی نازل ہوتی ہے اور وجدانی فنکار جذباتی کیفیت ختم ہونے کے بعد کوئی اصلاح نہیں کرتا ہے۔ اس سے روح فنا ہو جاتی ہے۔ اور جذبہ عنقا۔"

یہی وجہ ہے کہ ان کے اپنے دور میں ایک حلقہ تنقید و تبصرے

بھی کیا کرتا تھا۔ ان پر اعتراض بھی فرماتا تھا لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے
آغا صاحب غیر معمولی ہنس مکھ اور خوش طبع انسان تھے دشنام میں جدت
پیدا کرنا ان ہی کا کام تھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے کو بھی نہیں
بخشتے تھے اسی لیے ان کی باتیں کسی کو کھلتی نہیں تھیں۔ جہاں تک درسی علم
کا تعلق ہے وہاں تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی موٹی سی ڈگری اور بھاری
بھرکم سند نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ذہین غیر معمولی تھے مطالعہ کا بے حد شوق
تھا اور معلومات کا خزانہ تھے۔ عام طور پر یہ رائے ہے کہ ان کے مطبوعہ
ڈرامے عنقا ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح طور پر شائع نہیں ہوئے ہیں۔
عنقا ہونے کی وجہ تو یہ ہے کہ رجحان طبع بدل گیا ہے اور غیر صحت مند
ہونے کی بات ذرا غور طلب ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے خود بہت ہی
کم اشاعت کی طرف توجہ دی۔ دوسروں نے اپنے بھلے کے لیے شائع کرائے
ہو سکتا ہے کہ ان سے کچھ غلطی ہوئی ہو۔ لیکن اس کا امکان اس لیے زیادہ
نہیں ہے کہ جو کاپی وہ کسی تھیٹریکل کمپنی کو دیتے تھے یاران طریقت اسی
سے نقل کرتے تھے اور ان میں زیادہ تر لوگ ان ہی کی دنیا کے ہوتے تھے
پورے پورے "سین" ان کو ازبر ہوتے تھے۔ شاید اس طرح کا خیال اس
لیے بھی ابھرا ہے کہ جس سطح پر ہم ان کو دیکھنا چاہتے ہیں یا جو مقام ان کا ہم
نے متعین کر لیا ہے اس کے مطابق مطبوعہ ڈراموں کو نہیں پاتے ہیں۔
آغا صاحب میں بلاشبہ بڑی صلاحیتیں تھیں اور انھوں نے معیاری چیزیں
بھی لکھی ہیں۔ جیسے "عشق و فرض" لیکن حقیقتاً وہ عوامی فن کار تھے۔ ان کے
سامنے عوام ہوتے تھے وہ ان کے مذاق اور صلاحیتوں کو پوری طرح محسوس کرتے
تھے اور یہی راز ان کی مقبولیت کا بھی تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ آغا کے

عہد میں ڈرامہ نگاروں کی کوئی کمی تھی۔ بلاشبہ پڑھے لکھے اور اعلیٰ لوگ موجود تھے لیکن انھیں سب سے زیادہ کامیابی اسی وجہ سے ہوئی کہ وہ سامعین سے قریب رہے اور یہ جان گئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اور انھیں کیا دینا چاہیئے اور کس طرح دینا چاہیئے۔

آغا حشر ان خوش نصیب فنکاروں میں تھے جنھوں نے منہ مانگا دام پایا ہزاروں سے کھیلے اور پارسی تھیٹر کے مالکان ان کے غلام بنے رہے۔ کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کا چاہا پورا نہ کرے۔ انھوں نے شاہانہ مزاج پایا تھا اور ایسے مزاج کے لوگوں کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ ان میں بدرجہ اتم تھیں۔ ان کی دنیا میں بادہ نوشی اخلاقی جرم کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ سب کچھ کھلم کھلا کیا کرتے تھے اور جانتے و سمجھتے ہوئے بھی ان کے پرستار ان کی طرف کھنچتے تھے۔ کاروباری لوگ ہر عہد میں موجود رہے ہیں۔ جیسے آج کے عام ناشرین ان ہی لکھنے والوں کے ناز اٹھاتے ہیں جو عوام میں مقبول ہیں ویسے ہی پارسی تھیٹر کے مالکان بھی اس کے جوتے سر پر رکھنے کو تیار رہتے تھے جس کے نام پر لوگ لہالوٹ تھے۔ اور آغا صاحب کے نام کا یہ عالم تھا کہ ایک دنیا دیوانی تھی بس یہ معلوم ہو جانے کی دیر ہوتی تھی کہ ان کا ڈرامہ کب اور کہاں اسٹیج ہو رہا ہے۔ پھر تو سردی گرمی برسات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دور دراز سے لوگ آنا شروع ہو جاتے تھے اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے اکثر زحمتیں اٹھا کر پڑے رہتے تھے مگر ماتھے پر شکن نہیں آتی تھی۔

وہ ورہ ایک خاص انداز حیات رکھتا تھا۔ مکالموں میں جا بجا زور پیدا کرنے کے لیے اشعار داخل کیے جاتے تھے مسدس کی گرم بازاری تھی اور

میں نے پہلا بھی لکھا ہے ــــ اور پھر دوہرا رہا ہوں کہ

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ فلمی دنیا میں جب قدم رکھا تو سب سے پہلے آغا حشر مرحوم کا سایہ شفقت حاصل ہوا! اور باوجود کمسنی کے ان کا پسندیدہ نقل نویس بن گیا۔ یہ ان کا آخری دور تھا۔

وہ کبھی ڈرامے خود نہیں لکھتے تھے ان کے اندر جو تمثیل نگار چھپا بیٹھا تھا وہ ان کو بے چین کرتا تھا اور وہ ریشمی لنگی و جالی دار بنیائن پہن کر ٹہلنے لگتے تھے اور بولتے تھے بسا اوقات جو لوگ اس کام پر مقرر تھے وہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قلمبند کرتے جاتے تھے ـ آغا صاحب پر ایک کیفیت طاری ہوتی تھی ــــ اور ان کی اس کیفیت کا ساتھ دینا بسا اوقات لکھنے والوں کے بس سے باہر ہو جاتا تھا۔ اتنی تیز رفتاری ــــ جذبات کی شدت۔ اور بہاؤ ہوتا تھا۔ جسے گرفت میں لانا محال ہو جاتا تھا ـ پھر ایسا ہوتا تھا کہ وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاتے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے تھکن سی محسوس کرتے تھے۔ ماتھے پر پسینہ جگمگانے لگتا تھا۔ کیفیت تخلیق ـ طاری ہونے کے بعد وہ اپنے کو بالکل بھول جاتے تھے بعد میں اس کا احساس ہوتا تھا کہ کوئی کارنمایاں انجام دے کر چور چور ہو گئے ہیں۔ جب طبیعت ٹھہرتی تو حکم فرماتے تھے ـ جو کچھ میں نے لکھوایا ہے۔ پڑھ کر سناؤ " یہ منزل بھی کوئی آسان نہیں تھی۔ لفظ لفظ کی روح کو سمجھ کر ادا کرنا قیامت سے کم نہیں ہوتا تھا ــــ ؟ مگر اسے فن کار کے خلوص کی برکت کہئے یا ڈرامائی عناصر کی فراوانی کہ جو لوگ اداکار نہیں ہوتے تھے وہ بھی غیر محسوس طور پر اداکاری کا مظاہرہ کرنے تھے اور بڑی حد تک سلیقہ سے ان کے حکم کی تعمیل کرتے تھے ــــ رد و بدل کی شاید ہی کبھی نوبت آتی ہو انکا فرمایا ہوا حرف آخر ہوتا تھا۔ اور کہا بھی کرتے تھے " فن کارانہ عمل اضطراری ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ وحی نازل ہوتی ہے اور وجدانی فن کار جذباتی کیفیت ختم ہونے کے بعد کوئی اصلاح نہیں کرتا۔ اس سے رُوح فنا ہو جاتی ہے۔ اور جذبہ عنقا ــــ "

یہی وجہ ہے کہ ان کے اپنے دور میں ایک حلقہ تنقید و تبصرے بھی کرتا تھا۔ ان پر اعتراض بھی فرماتا تھا لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ آغا صاحب غیر معمولی ہنس مکھ اور خوش طبع انسان تھے۔ دشنام میں جذبات پیدا کرنا ان ہی کا کام تھا وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے کو بھی نہیں بخشتے تھے اسی لئے ان کی باتیں کسی کو کھلتی نہیں تھیں۔ جہاں تک درسی علم کا تعلق ہے وہاں تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی موٹی سی ڈگری اور بھاری بھرکم سند نہیں رکھتے تھے لیکن ذہین غیر معمولی تھے مطالعہ کا بیحد شوق تھا اور معلومات کا خزانہ تھے ــــ عام طور پر یہ رائے ہے کہ ان کے مطبوعہ ڈرامے عنقا ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح طور پر شائع نہیں ہوئے ہیں۔ عنقا ہونے کی وجہ تو یہ ہے کہ رجحان طبع بدل گیا ہے لیکن غلطی کا امکان اس لئے زیادہ نہیں ہے کہ جب کاپی وہ کسی تھیٹریکل کمپنی کو دیتے تھے یاران طریقت اسی سے نقل کرتے تھے اور ان میں زیادہ تر وہ لوگ انھیں کی دنیا کے ہوتے تھے پورے پونے سین" ان کو ازبر ہوتے تھے۔ شاید اس طرح کا خیال اس لئے بھی ابھرا ہے کہ جس سطح پر ہم ان کو دیکھنا چاہتے ہیں یا جو مقام ہم نے ان کا متعین کر لیا ہے اس کے مطابق مطبوعہ ڈراموں کو نہیں پاتے ہیں۔ آغا صاحب میں بلا شبہ بڑی صلاحیتیں تھیں اور انھوں نے معیاری چیزیں بھی لکھی ہیں۔ جیسے "عشق و فرض" لیکن حقیقتاً وہ عوامی فن کار تھے۔ ان کے سامنے عوام ہوتے تھے وہ ان کے مذاق اور صلاحیتوں کو پوری طرح محسوس کرتے تھے۔ اور یہی راز ان کی مقبولیت کا بھی تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے عہد میں ڈرامہ نگاروں کی کوئی کمی تھی۔ بلاشبہ پڑھے لکھے اور اعلیٰ لوگ موجود تھے لیکن انھیں سب سے زیادہ کامیابی اسی وجہ سے ہوئی کہ وہ سامعین سے قریب رہے اور یہ جان گئے کہ وہ کیا چاہتے ہیں ــــ اور انھیں کیا دینا چاہئے اور کس طرح دینا چاہئے ــــ

آغا حشر

ان خوش نصیب فنکاروں میں ہیں جنھوں نے منھ مانگا دام پایا۔ ہزاروں سے کھیلے اور پارسی تھیٹر کے مالکان ان کے غلام بنے رہے کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کا چاہا پورا نہ کرے۔ انھوں نے شاہانہ مزاج پایا تھا اور ایسے مزاج کے لوگوں کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ ان میں بدرجہ اتم تھیں ــــ ان کی دنیا میں پردہ پوشی اخلاقی جرم کی حیثیت رہتی تھی۔ وہ سب کھلم کھلا کیا کرتے اور جانتے وسمجھتے ہوئے بھی ان کے پرستار ان کی طرف کھنچتے تھے۔ کاروباری لوگ ہر عہد میں رہے ہیں۔ جیسے آج کے ناشرین ان لکھنے والوں کے ناز اٹھاتے ہیں جو عوام میں مقبول ہیں۔ ویسے ہی پارسی تھیٹر کے مالکان بھی اس کے جوتے سر پر رکھنے کو تیار رہتے تھے جس کے نام پر لوگ لہالوٹ تھے۔ اور آغا صاحب کے نام کا یہ عالم تھا کہ ایک دنیا دیوانی تھی۔ بس معلوم ہو جانے کی دیر ہوتی تھی کہ ان کا ڈرامہ کب اور کہاں اسٹیج ہو رہا ہے۔ پھر تو سردی گرمی برسات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دور دراز سے لوگ آنا شروع ہو جاتے تھے اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے اکثر زحمتیں اٹھا کر پڑے رہتے تھے مگر ماتھے پر شکن نہیں آتی تھی۔

وہ دور ایک خاص انداز حیات رکھتا تھا۔ اور مکالموں میں جا بجا زور پیدا کرنے کے لئے اشعار داخل کئے جاتے تھے مسدس کی گرم بازاری تھی اور خوب خوب تالیاں بجتی تھیں۔ یہی تالیاں کامیابی کی سند ہوتی تھیں اور ڈراپ سین کا بار بار اٹھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مختصر ڈراموں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نو بجے رات سے شروع ہو کر دو ڈھائی بجے تک جاگنا اور طول طویل ڈرامہ دیکھنا ناظرین کو مرغوب تھا اور ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی تھی جو نچلے طبقے یا درمیانی درجہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آغا صاحب اس حقیقت کو جان گئے تھے اور نہ یادہ سے زیادہ ان کی سودگی کا سامان فراہم کرتے تھے۔

انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر قدم نہیں رکھا۔ جب طوائف کے بارے میں یہ خیال مستحکم تھا کہ اس کے پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ اس گروپ میں کوئی ایسی ذات پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو محبت کرنا جانے اور وفاداری کا ثبوت دے اس وقت "آنکھ کا نشہ" نامی ڈرامہ پیش کیا وہی چھل کپٹ وہی فریب کاریاں اور وہی عام رجحان کی عکاسی ——

اسی طرح "دل کی پیاس" نامی ناٹک کو لیجیے مغرب زدہ خاتون کی اپنے شوہر سے بیزاری نیز بے اعتنائی دوسرے سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش اور مشرقی بیوی کا صبر و ضبط ایثار و قربانی وغیرہ وغیرہ ان کا موضوع رہا۔ وہ کبھی عوام کے برعکس نہیں چلے۔ انھوں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں وجدانی طور پر ایک تمثیل نگار موجود تھا۔ ڈرامائی عنصر کی بھی فراوانی تھی اور جب انھوں نے ایسے ڈرامے لکھے جن میں اشعار مکالموں سے خارج کر دیے اور محض نثر ہی کو کافی سمجھا تب بھی زور میں کوئی فرق نہ آیا اور توانائی بدستور باقی رہی —— ہم یہ نہیں کہتے کہ آغا حشر میں کوئی کمی تھی —— یقیناً وہ دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھا سکتے تھے اور نئے تجربے کر سکتے تھے مگر اس طرح کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ ہوئے۔ چوں کہ ان کے کاندھوں پر بڑا بار تھا وہ صرف کنبہ پرور ہی نہیں تھے بلکہ زندہ دل اور دوست نواز بھی تھے۔ ان کا خرچ کافی تھا۔ انھیں زیادہ سے زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ اور ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتے تھے جو ان کی راہ میں کانٹا ثابت ہو۔

"بھارتی بالک" میں انھوں نے مہاجن کی زیادتی، غریب بھائی کی بہن کی عصمت دری اور پھر اس کا طوائف بن جانا بڑے حسن سے پیش کیا ہے اور جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ محض پیٹ و روٹی کے کارن عورت عصمت فروشی پر آمادہ ہو جاتی ہے ان کی تائید میں سب کچھ ہے لیکن جو لوگ نفسیاتی اور تحقیقاتی عناصر کا تجزیہ

کر کے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اس کے اسباب جنسی بھی ہوتے ہیں اور ایک ہی رخ سے دیکھنا بجا نہیں انکے لئے کچھ نہیں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب اپنے ناظرین کی اکثریت کی تواضع کا سامان فراہم کرنے میں پیش پیش رہتے تھے ۔ اور اقلیت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے ۔

" ترکی حور " میں وہی اصلاحی رنگ ہے جو رواں دواں تھا ۔ لوگ شراب پینے کی طرف متوجہ تھے مگر چاہتے تھے کہ مے نوشی کی برائی ہو لہٰذا ایک نوکر کا کردار تخلیق کر کے انھوں نے مالک کو جی بھر کے ترک میخواری کے لئے آمادہ کرایا اور ایسا پلاٹ بنایا جس سے اس کے خراب نتائج شدت سے سامنے آجائیں ۔

" سلور کنگ " میں قماربازی کے نقصانات سے آگاہ کیا حالاں کہ ریس کھیلنا عام ہو چکا تھا اور ہر چھوٹا بڑا اس شوق میں مبتلا تھا ۔

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ آغا صاحب نے اپنے دل کی بات ناظرین کے سامنے نہیں رکھی حالاں کہ وہ نجی زندگی میں بڑے بے باک نڈر اور ترقی پسند تھے ۔ بس وہی بیان کی جو وہ سننا چاہتے تھے ۔ قدیم پور شدہ تہذیب کا مطالبہ بھی یہ ہوتا ہے کہ اسے آئینہ نہ دکھایا جائے صداقت سے کام نہ لیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ گرتی ہوئی دیواریں اب سنبھلنے کی نہیں ہیں ۔

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ کچھ قدیم قدریں بدرجہ اتم صالح ہیں ۔ لیکن ان کو دائمی و اتفاقی قرار دینا ضرور غور طلب ہے ۔ ایسا بھی دور انسان پر گزرا ہے کہ مے نوشی اس کے یہاں ممنوع تھی ، مجوب اخلاق ۔ اسی طرح قماربازی کو لیجیے ۔ اب تک یہ رائج ہے بلکہ دیپاولی کے موقع پر جوا کھیلنا بہترین شگون سمجھا جاتا ہے ۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آغا حشر نے صالح دائمی اقدار کا احترام نہیں کیا ۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے عہد میں چلن عام تھا کہ بچوں کو انگریزی تعلیم دلوائی جا

رہی ہے مگر منھ سے بڑا بھی کہا جا رہا ہے حالات تیزی سے پلٹا کھا رہے ہیں اور یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اب ماضی حال سے بدل جائے گا لیکن زبان سے اسی کے گن گائے جا رہے تھے۔ وہ روش عام سے اپنا دامن نہ بچا سکے یا یوں کہنا چاہیے کہ اپنی تخلیقات کی زیادہ سے زیادہ کامیابی کے لئے دل کی بات دل ہی میں رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔

اگر ڈرامہ نگاری آغا صاحب کے لئے ذریعہ معاش اور پیشہ کی صورت نہ اختیار کرتی تو یقینی وہ مواد و ہئیت دونوں کے اعتبار سے اس دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر سکتے تھے۔ ان کے عہد تک ان سے بڑا اور روشن دماغ تمثیل نگار منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ وہ بلا شبہ عظیم تھے انھیں مجبوراً مثالی کردار پیش کرنا پڑے ہیں اور "آدرش وادی" ہو کر رہ گئے ورنہ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ انسان کو اس کے اصلی روپ میں پیش کریں اور دنیا کو بتائیں کہ وہ شیطان بھی ہو سکتا ہے اور فرشتہ بھی اس کی تخلیق ہی کچھ اس طرح ہوئی ہے لیکن دشواری یہ تھی کہ دیکھنے والوں کی اکثریت اس پر آمادہ نہیں تھی۔ چنانچہ انھیں بھی اپنے اوپر جبر کرنا پڑا اور عام زندگی میں چاہے ایسا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ ہر مصیبت کے موقع پر بھگوان کرشن کا مدد کو پہونچ جانا اور کسی پیر مرد کا عقدہ کشائی فرمانا ان کے لئے بھی لازم ہو گیا تھا اس طرح کہ مفروضات سے جس قدر انھیں گھبراہٹ ہوتی تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ زمانہ جیسے ہی آگے بڑھا ویسے ہی انھوں نے اجتناب کیا۔ اور ان کے آخری دور کے ڈراموں میں یہ روایتی عناصر مفقود ہیں۔

آغا صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ الفاظ بڑے جچے تلے استعمال کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتی ٹکے ہوئے ہیں اور کوئی لفظ بھی اپنی جگہ سے ہٹا یا گیا تو چھٹا نگ میں فرق آ جائے گا۔ تشبیہات کے معاملے میں بھی ان کا فن

بہت اجاگر ہے "سیتا بن باس" نامی ڈرامہ میں ایک جگہ اپنے کردار سے کہلواتے ہیں۔ ع

چٹکی کا تیر، مُکھ کا وچن استری کا پیر
نکلا جب اپنے گھر سے سدا کو نکل گیا

اسی طرح تاریخی حقائق نمایاں کرنے میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں ۔۔ اپنے ایک ناٹک میں تحریر فرماتے ہیں "جس جاتی میں کرن جیسا دانی، بکرم جیسے نیائی اور ہریشچندر جیسے ستیہ وادی مہاتماؤں نے جنم لیا ہو اس جاتی کی یہ دُردشا"؟ ان کو اردو ہندی سے یکساں پیار تھا۔ انھوں نے دونوں کی گرانقدر خدمت کی ہے ۔۔۔ لسانی اختلاف کو کوئی جگہ نہیں دی ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کے بزرگوں کی خصوصیات کا اعتراف کرنے میں بھی آگے رہے ہیں اور انتہائی غیر متعصب صاف دل و دماغ کے انسان تھے۔

حکیم احسن لکھنوی مرحوم کے بعد ناٹک کی دنیا میں پنڈت گھنشیام کتھا واچک اور پنڈت بیتاب جیسے لوگ داخل ہو گئے تھے اور ہندو ناظرین کے لئے مذہبی ڈرامے لکھنے کا حق اپنے کو حقدار سمجھ رہے تھے آغا صاحب نے اپنے زور قلم سے ان کو بتا دیا کہ فن کسی کی جاگیر نہیں ہوتا نہ اس میدان میں ہندو مسلم، سکھ، عیسائی کی تفریق مناسب ہے۔ یہ تو وہ منزل ہے جسکو ریاضت سے طے کیا جاتا ہے اور جو خلوص قلب سے محنت کرتا ہے وہی بہت کچھ پاتا ہے۔ انھوں نے "بلوا منگل" نامی ڈرامہ لکھا اور ہندو ناظرین سے خراج عقیدت حاصل کیا ۔۔۔ ان میں علم کی لگن تھی ایسے لوگ بھی ان کے حلقہ بگوشوں میں تھے جو مختلف زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور ہر قسم کی کتابیں ان کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ان میں جذبۂ قبول کا مادہ شدت سے تھا۔ ان کا حافظہ بیحد قوی تھا۔ جو بات گرہ میں باندھ لیتے وہ کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے اچھے اچھے علماء ادیان ان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے خوفزدہ ہوتے

تھے۔ ان کو منطق اور فلسفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ تصوف پر بھی ان کی نظر تھی اور انہ
وطن سے بھی ان کو گہرا لگاؤ تھا ـــــ مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی کے وہ ہم نوا
تھے۔ اور اکثر کھدر پہننا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم سے بھی ان کی
گاڑھی چھنتی تھی۔ اور ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی ارتباط تھے۔۔ وہ کسی سے مرعوب ہونا نہیں
جانتے تھے ہر معاملہ میں اپنی ایک رائے رکھتے تھے اور اسی لئے مسلم لیگ کا جادو ان پر
کبھی نہیں چل سکا ـــــ

آغا حشر کی شناسائی کے لئے ہمیں وہ دور نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے جس
میں ان کے کمال فن نے انگڑائیاں لیں۔ اور یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس وقت زیادہ تر تھیٹر
کی دنیا پارسی حضرات کے قبضہ میں تھی اور بیرونی اثرات کے نیچے سے زمین ضرور نکل چکی تھی۔
لیکن پرانی روایات سے چمٹے رہنا کم وبیش سب کو پسند تھا۔۔ اسٹیج ڈرامے کے لئے
یہ ضروری تھا کہ ہیروئن حسین اور پاکدامن ہو، ہیرو میں تمام اوصاف حمیدہ جمع ہوگئے ہوں
اور ایک بدمعاش صفت انسان بھی ہو جسے اپنے کئے کا پھل ضرور مل جائے ـــــ
ایسا ممکن نہیں تھا کہ عام زندگی کی عکاسی کی جائے۔ ہیروئن کو قبول صورت نہ دکھایا
جائے ہیرو کو اوصاف حمیدہ کا مجموعہ نہ بتایا جائے اور بدمعاش کو اپنی بداعمالیوں
کے نتائج چکھنے سے باز رکھا جائے ـــــ اب ظاہر ہے کہ ان پابندیوں کے ساتھ
جب کا بھی قلم اپنے جوہر دکھائے گا وہ کتنا ہی بلند و قامت فن کار کیوں نہ ہو محدود
ہو کر رہ جائے گا۔ آغا صاحب کی تو یہ بہت بڑی بلندی ہے کہ انھوں نے ایک دائرہ
کے اندر رہتے ہوئے اپنے جوہر نمایاں کئے۔ اس کا بہت بڑا راز یہ ہے کہ وہ فطرتاً
ڈرامہ نگار تھے۔ الفاظ کا اتار چڑھاؤ جانتے تھے اور اپنی تحریر میں زور پیدا کرنا
انھیں سب سے زیادہ آتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے ان کو انڈین شیکسپیئر کہا جانے لگا۔
تھا۔ اور ہندوستانی تھیٹر میں وہ واقعی شیکسپیئر کی طرح مقبول بھی ہوئے ان کا شاہ

بڑا گہرا تھا۔ انھوں نے ہر صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ دیکھا تھا۔ اسی لئے ان کے کردار زندگی سے بھرپور ہیں اور ان میں حیات کی پوری پوری جھلک اپنے جلوے دکھاتی ہے۔

آغا صاحب کے ڈرامہ آرائش و زیبائش کے محتاج نہیں ہیں گو رنتھیں تھیٹریکل کمپنی کے مالکان تجارت کرنا جانتے تھے اور انھوں نے اعلیٰ ترین سٹ "لگانے میں اور ملبوس وغیرہ بنوانے میں بھی نئے تماشے کے موقع پر دریادلی دکھائی پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آغا صاحب کا زور قلم کسی کا محتاج تھا۔ وہ اپنے اندر اتنی کشش اور جاذبیت رکھتا تھا کہ بلا شرکت غیرے سامعین اور ناظرین کو اپنا گرویدہ بنا سکتا تھا۔ ان کے قلم میں بلا کی چمک تھی۔ روانی ان کا طرہ امتیاز تھی۔ اور برجستہ مکالمہ لکھنا ان ہی کا کام تھا۔ ایک صفت اور غضب کی تھی وہ یہ کہ جو کردار بولتا تھا وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں اس قدر ٹھوس دلائل رکھتا تھا کہ سننے والا یہ طے کر لینے پر آمادہ ہو جاتا تھا کہ اس کا جواب ممکن نہیں ہے۔ لیکن مدمقابل جب بولنے پر آتا تھا تو حیرت ہوتی تھی۔ — آغا صاحب کا یہ بہت بڑا کمال تھا کہ وہ مکالمے لکھنے میں عوام کی نفسیات کو مدنظر رکھتے تھے۔

ڈاکٹر جانسن کے مقولے پر انھوں نے ساری عمر عمل کیا۔ وہ کہتا ہے "قبول عام کسی کی مقبولیت کی آخری سند ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مقبول عوام لوگوں کو ناقابل اعتنا سمجھنے والے آغا حشر مرحوم کے معاملہ میں کیوں خامہ فرسائی فرماتے ہیں۔ یا تو ان کی قد آور شخصیت سے مرعوب ہو گئے ہیں یا سرکاری و نیم سرکاری طور پر عہد حاضر میں جو ان کے کمال فن کا اعتراف کیا جا رہا ہے اس میں شرکت فرما کر اپنی بالغ نظری کا ثبوت دینا چاہتے ہیں —

آغا صاحب ہائی اسکول بھی پاس نہیں تھے۔ چھٹے درجہ تک باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے انھوں نے چھوڑ دی۔ ڈگری اور ڈپلومے کو سب کچھ سمجھنے والوں کے لئے سچ پوچھئے

تو ان کی ذات مستقل طنز ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ علم موٹی سی ڈگری پانے کا نام نہیں ہے مجھے دیکھو میں نے کہاں سے کیا کچھ حاصل کیا اور مرتے مرتے اپنے کو طالب علم خیال کر کے کس قدر پایا۔ ان کے ڈرامہ اور ڈرامہ نگاری کو سمجھنے کے لئے قیاس آرائی کی ضرورت نہیں ہے وہ بالکل کھلی کتاب ہیں۔ انھوں نے تھیٹر کے شوق میں گھر بار چھوڑا۔ آدمی بیباک اور نڈر تھے لہٰذا دوسروں پر منھ آنے سے بھی نہیں چوکے۔ وہ جان رہے تھے کہ انکے عنفوان شباب میں جو پارسی تھیٹریکل کمپنی کا مزاج تھا۔ اور اس کے ڈرامے دیکھنے والے عوام جس قسم کے تھے ان کے لئے ایک چلتا پھرتا ڈرامہ لکھ دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے بس تھوڑی سی ذہانت اور اداکاری و اسٹیج کی تکنیک سے واقفیت ہوتی چاہیے۔ آغا حشر میں یہ باتیں تھیں لہٰذا کامیاب رہے ساتھ ہی ساتھ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے میں بھی وہ مشاق تھے اس لئے وقت کے تیور دیکھ کر بات کرتے تھے۔ اور جس وقت عوام نے جو مانگا انھوں نے وہ دیا۔ وہ اپنی تسکین کے لئے نہیں لکھتے تھے بلکہ دوسروں کی طلب پوری کرتے تھے۔ یہ کہنا کہ اگر وہ سستی شہرت سے بچ کر ڈرامے لکھتے اور زندگی کی انفرادی و سماجی کشمکش کی بنیادوں پر اپنی ڈرامہ نگاری کی بنیاد رکھتے تو حشر کا نقش تاریخ ادب اردو پر اور گہرا ابھرتا اور وہ ان نقائص کا شکار نہ ہوتے جو تجارتی پارسی اسٹیج نے انھیں ورثہ میں دیا تھا" محض قیاس آرائی ہے۔ وہ بہت صحیح راہ چلے تجارتی پارسی تھیٹر اور عوام سے وابستہ ہو کر انھوں نے اپنے کو مستحکم کر لیا ورنہ ان پر گفتگو کرنے کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہ کرتا جس معاشرے میں موٹی سی سند، اقتصادی استحکام اور سماجی پوزیشن کے مدنظر فن کار کو پرکھا جاتا ہے اس میں بھلا ان کی قدر و قیمت کیا مقرر ہوتی ـــــــ وہ ایک خود شناس انسان تھے اپنے ادبی کچھ لکھوانے کے لئے خوشامد نہیں کر سکتے تھے اپنے مذاق کا گلا نہیں گھونٹ سکتے تھے اور شیخ نااہل کو مرد خدا نہیں کہہ سکتے تھے پھر انکا انجام کیا ہونا ظاہر ہی تھا ظاہر ہے۔

تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ یہی عدم توازن رضا علی وحشت کلکتوی کے ساتھ بھی دکھائی دیتا ہے ابتداء میں تو ضرور سر عبدالقادر بھی ان کی طرف کھنچے اور دوسرے حضرات نے بھی ان کا ذکر خیر کرنا فرض سمجھا لیکن ہمارے موجودہ نقادان فن نے انھیں برکت میں سمجھنے کی چیز سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور دہلی و لکھنؤ پر تو کام کرنا سعادت خیال کیا گیا ہے دوسری جگہ کے اہل کمال کو اس طرح نظر انداز کیا گیا جیسے وہ ناقابل اعتنا تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دہلی و لکھنؤ مرکز زبان و ادب نہیں رہے ہیں اور یہاں کی مردم خیز سرزمین نے لعل و گہر نہیں اگلے ہیں مگر قائم چاند پوری نے بھی ریاض کیا آخر یہ کیا ستم ہے کہ ان کی طرف بہت کم نگاہیں اٹھتی ہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نقاد بھی اپنی ساکھ قائم کرنے کے لئے وہی بولی بولتے رہے ہیں جو سب کو پیاری ہو۔ ان کے پیش نظر تلاش و تجسس کا شوق نہیں رہا ہے بلکہ پوری طرح توجہ اس پر دی گئی ہے کہ ع

"چلو اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی"

اس سے زبان و ادب کو بجائے فائدہ پہونچنے کے غیر معمولی نقصان ہوا ہے اور اردو کی ہمہ گیری میں فرق آیا ہے۔ ارباب فن کسی فرقہ علاقہ یا کسی خطہ سے مخصوص نہیں ہوتے۔ وہ ساری کائنات کے لئے ہوتے ہیں۔ اور سب کم و بیش روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہیں کا ہو اور کسی زبان میں اس نے جوہر دکھائے چیخوف اور موپساں نے سمندر پار اپنے جلوے لٹائے مگر ہم بہت کچھ ان سے حاصل کرتے ہیں اور ملکی و غیر ملکی کا سوال نہیں اٹھاتے۔ پھر یہ کیا ستم ہے ایک دیس کے بسنے والوں میں تفریق و امتیاز کی دیواریں کھڑی کی جائیں اور یہ نہ دیکھا جائے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے بلکہ اس پر توجہ دی جائے کہ کون کہہ رہا ہے۔ اقبال کا ذکر خیر اس کثرت سے نہ ہوتا اگر ان کو قدر داں اور پنجاب کے لوگ نہ ملے

پوچھئے تو زیادہ تر حضرات نے اپنی دانشمندی اور وسیع النظری ثابت کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے ان کے بہانے اپنی شہرت مطلوب رہی ہے حقیقتاً تنقید کا حسن اگر اجاگر کرنے کی بہت کم لوگوں کو تمنا رہی ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلی سنہ ۳۰ء کے فروری و مارچ کے شمارے میں محاسن شعری کا ذکر فرماتے ہوئے کہا تھا کہ۔ محبت کے معاملے میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو عام اس سے کہ وہ جذبات علوی ہوں یا سفلی"۔

تقریباً اسی طرح کی بات انھوں نے میر مہدی حسن مجروح کے تذکرہ میں بھی فرمائی ہے اور ارشاد کیا ہے "شاعری اور استادی کا صرف یہی کمال نہیں ہے کہ مضمون بلند ہو زبان صحیح یا ردیف کھلتی ہو اور قافیہ تازہ بلکہ ان سب باتوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی جو سب سے زیادہ مشکل ہے اور سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے وہ انتخاب الفاظ سے متعلق ہے"

اگر ہم محض حسرت موہانی کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے محبت کے معاملے میں تصنع سے کام لینے کو عیب تصور کریں اور انتخاب الفاظ کو ہنر تو بھی رضا علی وحشت ہماری پہلی ہی مجرم قرار دی جائے گی۔ چوں کہ وہ صاحب کمال فن کار ہے جس نے ساری عمر بناوٹ سے پرہیز کیا ہے اور انتخاب الفاظ کو اہمیت دی ہے۔ اس کا فن وقت کے بندھنوں سے آزاد ہے۔ دائمی عناصر کی نقاب کشائی کرتا ہے اور جمالیاتی تسکین پہونچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

لیکن کسی کو چڑ سی تھی کہ جو دور دراز کے لوگوں کا مطالعہ گہرا مطالعہ کرتا ہے کیوں نہ ان ہی لوگوں پر خامہ فرسائی کرتا جن کا بول بالا تھا۔ آل احمد سرور کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ

"ہماری تنقید میں اب تک بیشتر پروپیگنڈا ہیں"

جی چاہتا ہے کہ اس ٹکڑے میں مزید اس کا اضافہ کروں کہ صرف دوسروں ہی کا پبلسٹی پروپیگنڈا نہیں ہے بلکہ اپنی ذات و صفات کا بھی پروپیگنڈا ہے بلکہ یہی غالب ہے۔ اور اس قسم کے اشعار وحشت کلکتوی مرحوم کی توجہ طلب نہ قرار دیئے گئے۔ ع

اللہ رے زور مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے

گو تری یاد دشمن صبر و قرار ہے
لیکن اسی پر جینے کا دار و مدار ہے

ہوتے ہیں کامیاب جہاں اتنے اہل شوق
وحشت بھی اک نگاہ کا امیدوار ہے

باوجود ایک اچھا خاصہ وقت گزر جانے کے بھی ہم میں توازن و اعتدال کا نام و نشان نہیں ہے کسی کی مدح و ستائش کرنے کے لئے پہلے سے کمربستہ ہوں گے تو سارے عیوب پس پشت ڈالکر تنقیدی جوہر دکھلانے سے باز رہیں گے اور کسی کے لئے قلب کے گوشے میں کوئی گنجائش نکال سکیں گے تو پھر اس کے بخیئے ادھیڑنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اسی لئے ہمارے درمیان تاثراتی تنقید کی ہنوز گرم بازاری ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر یوسف حسن خاں نے بڑی معقول بات فرمائی ہے کہ۔

"غزل گو جو کچھ کہتا ہے اپنے میں ڈوب کر کہتا ہے"

مگر ہم میں زیادہ تر لوگ ہنوز اثر و قبول دولت سے نابلد ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ جس کے سلسلہ میں خامہ فرسائی کر رہے ہیں اس پر کس کس بڑے شاعر کا تاثر حاوی ہے۔ اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ وہ پیروی حافظ و خیام میں نمایاں ہے اس لئے قطعی ممتاز شاعر ہے۔ حالانکہ یہ بڑا سطحی معیار نقد ہے۔ پیروی تو ایک دوسرے کی کرتے ہی آئے ہیں میاں دلگیر نے جس طرح کے بند مراثی میں کہہ رکھے ہیں اسی طرح کے بند میر انیس نے بھی لکھے ہیں لہٰذا شاد عظیم آبادی نے اپنی کتاب میں اسکو سرقہ قرار نہیں

وہاں ہے ان کی تائید میں کوئی بھی شاید اس کی جرات نہ کرے اور یہ کہکر آگے بڑھ جائے کہ چراغ سے چراغ تو جلا ہی کرتے ہیں لیکن وحشت نے بڑی صفائی سے کام لیا ہے۔

ایک خط میں ارشد کاکوری مرحوم کو رقم فرمایا ہے۔

"ہاں آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں داغ کے پرستاروں میں ہوں یہ بات در اصل نہیں۔ میں حضرت شمس کا شاگرد ہوں اور وہ داغ کے شاگرد تھے اس تعلق کی بنا پر داغ کا احترام مجھ پر لازم ہو گیا لیکن میں نے ان کے کلام کی تقلید نہیں کی۔ غالب کی تقلید میں نے بیشک کی۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ کچھ اور جنل خیالات نہ پیش کر سکوں میرے دیوان کا مطالعہ اگر ہوگا تو ظاہر کر دیگا کہ میں نے بھی کچھ نہ کچھ پیش کیا ہے۔؟"

ڈاکٹر یوسف حسن خاں کے جملے کی اس سے بڑھ کر اور توثیق کیا ہو سکتی ہے؟ میں اسی کتاب میں قبل دو ایک مقام پر لکھ چکا ہوں کہ "اندر سے زیدہ" کا بھی یہی خیال ہے کہ شاعر اپنے داخلی تجربات اور احساسات سے زیادہ کام لیتا ہے اور حضرت وحشت نے بڑی بے باکی سے فرمادیا ہے کہ غالب کی تقلید تو کی ہے مگر انھوں نے اوریجنل اور خیالات سے بھی دامن نہیں بچایا ہے۔ جو کسی بڑے شاعر کا مقلد ہونا اوچھی بات سمجھتے ہیں۔ اور بعض ناقدین کے لئے میدان تیار کر دیتے ہیں کہ وہ ان کو نقش قدم پر گامزن ہونے والا کہکر ان کی رفعت و عظمت آشکارہ کریں۔ وحشت نے ان کا منھ بند کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ میں صرف مقلد غالب نہیں ہوں بلکہ میرا اپنا بھی بہت کچھ دیوان میں موجود ہے شرط ہے گہرے مطالعہ اور سنجیدہ نظر کی۔

یگانہ چنگیزی جن کے بارے میں غلط طور پر یہ بات مشہور ہو گئی کہ وہ غالب کے کمال فن کے معترف نہ تھے اپنے ایک خط میں حضرت وحشت کے کلام کو دیکھ کر لکھتے ہیں کہ "اس وقت اگر غالب کو سمجھ کر صحیح پیروی غالب کرنے والا کوئی ہے تو وہ صرف رضا علی وحشت الکلکتہ ہیں۔ وہ محض غالب کے ردیف و قافیہ میں غزل کہہ لینا اور

شعر نکال لینا کوئی کمال نہیں۔ (یہ خط مولوی مصطفےٰ حسین جوہر کے پاس محفوظ تھا جو مدرسہ عباسیہ پٹنہ سیٹی میں سب کو دعوت نظارہ دے رہا ہے میں نے اُس کی زیارت کی ہے)

کسی کی تقلید اور پیروی محض اس کی آواز سے آواز ملانے میں پوشیدہ نہیں ہوتی بلکہ اپنی طبیعت کے بہاؤ کا بھی ناقدانہ نگاہ سے جائزہ لینا پڑتا ہے چنانچہ وحشت ایک مقام پر فرماتے ہیں۔ ع

اگرچہ طبع خداداد تھی مگر وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لئے

وحشت نے اپنی بڑائی اس میں نہیں سمجھی کہ روساء شہر کی حد سے اپنا حلقہ بنا کر خودی کو موٹا کریں اور چاروں طرف سے غالبیوں کی واہ واہ سنیں بلکہ ان کو معلوم تھا کہ غالب کی تقلید اور پیروی تو بڑی چیز ہے پہلے غالب کے اشعار کی روح کو تو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ جو بڑے بڑوں سے ممکن نہیں ہے پھر ہما شما کیا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کہنے والا کہاں تک کس کی تقلید میں ناکام ہے یا کامیاب ہے۔

مولانا حالیؔ جن کی حیثیت ایک ناقد فن کی بھی ہے "مخزن" میں وحشت کا کلام برابر دیکھتے تھے۔ اور متاثر ہو کر ایک خط میں ان کو لکھا تھا کہ

"مولانا اگر انصاف سے دیکھئے تو مرزا کا تتبع درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا۔ مگر آپ نے یہ حق ہم سے چھین لیا"

ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے بھی غالباً اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ تنقید میں جو ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور لکھنے کے ذوق و شوق میں جن لوگوں نے نہ صرف ان کو پیروئ غالب میں ناکام قرار دیا ہے بلکہ وہ دماغی کاوش کا ممنون کرم بھی بناتا ہے اس کا کھل کر ازالہ کرتا بات وہی محنت کی آتی ہے کون ہے جو دہلی و لکھنؤ کا حصار توڑ کر چند گنے چنے لوگوں کے علاوہ چھان بین کرنے پر تیار

ہوتا لہٰذا یہ کہنا اس صحیح ہوگا کہ ہمارے نقاد کو جس قدر وسیع النظری سے پیش آنا چاہیے تھا وہ ہنوز نہیں آسکے ہیں اور ان ہی لوگوں پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہیں جنکے بارے میں آسانی سے جمع شدہ مواد فراہم ہو جاتا ہے۔

دل کے ساتھ ساتھ دماغ سے کام لینا کسی فن کار کیلئے کوئی جرم تو نہیں ہے۔؟ ہر آرٹسٹ اپنے آرٹ کو سنوارتا ہے غور و فکر کو راہ دیتا ہے اور دماغ سے تعاون کا خواہاں ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم اس کی کاوش کو ایک سجا ہوا گلدستہ کہتے ہیں اور الفاظ کا پیرہن چاک کر کے نقش فریادی کے دل کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ صاحب فن کے پاس صحافتی ہنر نہیں ہوتا۔ وہ اظہار واقعہ کے لئے ان خوبیوں کا استعمال کرتا ہے۔ تشبیہات و استعاروں کی مدد لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ فن کاری کے جوہر بھی نمایاں ہوں اور مطلب بھی واضح ہو جائے۔ ہم اس کی قدر و قیمت اس اعتبار سے تو معتبر کرنے کا اختیار رکھتے ہیں کہ اس نے کہاں تک اپنے مطلب کے لئے مندرجہ بالا اشیاء کا استعمال کیا ہے لیکن ہمیں کا حق ہمیں نہیں ہے کہ بغیر سوچے سمجھے حکم لگا دیں کہ اس نے دماغ سے زیادہ کام لیا ہے اور دل کی آواز پر کان نہیں دھرا ہے۔ شعر و ادب میں دیکھنے کی چیز اس کا لطف بھی ہے۔ اگر کوئی فن پارہ لطف اندوز نہیں کرتا تو وہ یقینی بے کار محض ہے۔ تمام تر پمفلٹ نگاری ہے اس سے کہیں بہتر ہے صحافت سے کیف لینا اور بیشک ہم ایسے فن کار کو دماغی مشقت کرنے والا کہیں گے۔ لیکن جہاں صورت حال برعکس ہو وہاں یہ رائے قائم کرنا حق بجانب نہیں۔؟ کون کہہ سکتا ہے کہ وحشت نے اردو شاعری کو کچھ نہیں دیا۔ یا ان کی مساعی صرف دماغی اختراع و لیجانے ہے۔ ذرا اب ملاحظہ تو فرمائیں یہ اشعار۔ ع

اللہ رے زور مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے

گو تری یاد دشمنِ صبر و قرار ہے
لیکن ابھی یہ جینے کا دار و مدار ہے
ہوتے ہیں کامیاب جہاں اتنے اہلِ شوق
وحشتؔ بھی اک نگاہ کا امیدوار ہے

دیر ملا ہمارا راہ میں کعبہ کو ہم نکل گئے
جذبۂ شوق میں دماغ کس کو ہوا امتیاز کا

الٰہی گر نہ ذوق انگیز ہو لذتِ اسیری کی
نگہ صیاد کی ہو جائے برقِ آشیاں مجھکو

گلستاں کر دیا ہے دامنِ دل کو تصور نے
ہوائے شوق میں حاصل ہے عشقِ جاوداں مجھکو

الفاظ شعر و ادب میں ایک نقاب کی حیثیت رکھتے ہیں ان پر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا بلکہ یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ان کا مفہوم کیا ہے فیض بلاشبہ بلند ترین ترقی پسند ہیں لیکن جب وہ موسم اور بام و در کی بات کرتے ہیں تو ان کے مطالب کچھ اور ہوتے ہیں اسی طرح وحشت کی شاعری اور ان کے قدیم انداز بیان تک ہمیں اپنے کو محدود نہ کرنا ہوگا بلکہ یہ دیکھنا پڑے گا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے انداز میں معنی و مفہوم کس طرح پنہاں ہوتے گئے ہیں اور اس کے لئے کوئی ضروری نہیں ہے کہ کلکتہ والے ہی ان پر قلم اٹھائیں، وہ سارے ملک کے تھے ان کا حق سب پر ہے اور ناقدین فن کا فرض اولین ہے کہ در بے بہا جہاں بھی ان کو نظر آئیں وہاں وہ تلاش کریں اور تاثراتی تنقید سے بالاتر ہو کر جوہر دکھائیں۔ یہی ان کا فریضہ ہے منصب ہے اور تلاش و تحقیق جزو ایمان بھی۔ کوئی کسی شہر میں تلاش معاش کے لئے بس جاتا ہے شادی بیاہ کر لیتا ہے اس کو وطن کی فضا راس نہیں آتی اغیار ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو جاتے کہ وہ وہیں کا سمجھا جائے۔ اور جہاں وہ پیدا ہوا گھر بار رہا اور بزرگوں نے تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا وہاں اس کا کوئی حق نہ رہا؟ اگر یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر ریاست کا باشندہ ہی اس ریاست پر

اپنا صحیح حق رکھتا ہے تو پھر واجب ہو جائے گا کہ اہل فن کو خانوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایسے انسانیت اور فن کا تو کوئی بھلا نہ ہوگا البتہ آدمی سمٹ جائے گا اور اپنے خول میں داخل ہوتا جائے گا۔

وحشت کو اس عینک سے دیکھنا صرف ان کی توہین نہیں ہے بلکہ ہمارے نقدِ نظر کی بھی فضیحت ہے۔ ان کے آباؤ اجداد دہلی سے ہوگلی آ گئے تھے۔ یہاں ان کا قدیم پیشہ طبابت تھا وہ کلکتہ پر جان و دل وارنے لگے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ وہ پوری دنیا کے عاشق زار تھے ان کا مشرب محبت تھا۔ وہ غزل کی آبرو تھے۔ اور نیاز فتحپوری کو ہمیشہ اس پر پر خلوص شکایت ان سے ہوئی ہے کہ وہ میرے ماہنامہ تجلی کلکتہ کو اپنی معرکۃ الآرا غزلوں سے نوازتے ہیں اور ان کو کبھی یاد نہیں کرتے۔

آغا حشر اور رضا علی وحشت کے سلسلہ میں اس قدر گفتگو کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ہمارے تنقیدی عمل کا پتہ چل سکے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کیا کر رہے ہیں۔؟ یقیناً کسی ایک شخص پر اس کی ذمہ داری نہیں آتی کہ اس نے سارے لوگوں کو کیوں نہیں پڑھا۔ یا چھوٹوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کا مطالعہ کیوں نہیں کیا؟ اول تو دائرہ وسیع ہے ایک شخص کے کرنے کا یہ کام بھی نہیں ہے پھر تلاش و تجسس کا بڑا تعلق تاثر ہے کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر فرد یکساں طور پر متاثر ہو؟ ہو سکتا ہے کہ ہم کو جو قابل اعتنا نظر آتا ہے وہ دوسرے کو نہ آئے اور وہ اس سے متعلق اظہار خیال نہ کرے بلکہ بات اشخاص کی نہیں کی جاتی ہے پورے تنقیدی عالم و معاشرے کی ہے۔ ہم کسی ایک کو مورد الزام قرار بھی نہیں دے سکتے نہ کسی ایک کو گناہ گار ٹھہرا سکتے ہیں سبھی اس میں مبتلا ہیں۔ کم و بیش ہمارا آپ کا یکساں طور پر دامن داغدار ہے۔ حیرت و استعجاب کی بات تو یہ ہے کہ تنقیدی عمل بھی تعلقات کا پابند ہے کچھ لوگوں پر ہمیں دعوت

دی جاتی ہے لکھنے کی وہ سماج کی طرف سے ہو سرکار کی طرف سے ہو یا افراد کی طرف سے۔ اور ہم بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا انکشاف نہیں کر سکتے۔ چبا چبا کر گفتگو کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ واقعی جو جیسا کچھ ہمارے خیال میں ہے ویسا ہم بیان نہیں کر سکے ہیں اور اخلاقی ضابطے کے تحت لب کشا ہوئے ہیں۔ اس سے صرف یہ نہیں ہوا ہے کہ ہماری تاریخ نظری مشکوک ہوئی ہے بلکہ جن پر ہم نے روشنی ڈالی ہے ان کا بھی تمام تر حسن نکھرنے نہیں پایا ہے نقاد نہ نقال ہوتا ہے نہ مصاحب وہ بھری بزم میں اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیتا ہے۔ کسی کو ناگوار ہو یا پسندیدہ اسے اس سے بحث نہیں ہے۔ اس کی نیت نہ دل توڑنے کی ہوتی ہے نہ ہمت شکنی کی نہ وہ خاطراً اور احتراماً ایسی رائے دیتا ہے جو اس کا داخلی وجود پسند نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ عام طور پر اس سے اتفاق نہ ہو اور ایک نقاد سے دوسرا نقاد بھی متفق نہ ہو۔ تو اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا اپنی اپنی فکر کی بات ہے

کمتری و برتری کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب زیادہ تر لوگ ایک ہی طرح کی بات کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بذات خود کوئی چھان بین کا مادہ نہیں ہے بلکہ دوسروں کی بولی بولنا سعادت خیال کر رہے ہیں۔ نقاد کے لئے دوسروں کی بولی بولنا کوئی حسن نہیں ہے۔ وہ ایک محقق کے طور پر اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ بہت سی نئی پرانی کتب کے حوالے دیتا ہے کہ نہ اگلے پچھلے لوگوں کی گفتگو دہراتا ہے۔ اس کے شعور نظر کا یقین تو اس وقت مستحکم ہوتا ہے جب وہ اپنے طور پر ہمیں کچھ نئی راہیں دکھاتا ہے اور روشنی طبع کا مظاہرہ کرتا ہے۔ آغا حشر ہوں یا رضا علی وحشت علامہ آرزو ہوں یا صفی لکھنوی ایک نقاد کی نظر میں پرکھنے کی چیز ہیں۔ وہ ان کی ذاتی حیثیت اقتصادی بلندی یا پستی سماجی اور سیاسی عزت سے مرعوب ہو سکتا ہے نہ متاثر اگر وہ ان کو گراں قدر متاع خیال کرتا ہے تو نثر میں اعداد میں بھی بہانگ دہل کہتا ہے اور اگر اس کے برعکس

سوچتا ہے تو کسی کی خاطر یا لحاظ سے وہ بات زبان پر لا ہی نہیں سکتا جو اس کا ضمیر گوارہ نہیں کرتا ہے۔

تنقید آسان نسخہ نہیں ہے۔ یہ لوہے کے چنے ہیں جنکو چبانا بہت دشوار ہے۔ اس راہ میں اچھّے بھلے انسان کو معتوب بننا پڑتا ہے جاہل و بے خبر کہا جاتا ہے منھ پھٹ اور گستاخ کا خطاب ملتا ہے اور دوست کم دشمن زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے لوگ ذرا کانپتے ہیں اور ایسے حضرات کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں جو اپنی کسی بھی حیثیت کی بنیاد پر معاشرے میں قابل قدر قرار دیئے جاتے ہیں ان کے ہمنواؤں کو بھی ترچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ دستور حیات نہ ہمیشہ راس آسکتا ہے نہ ہمیشہ ہی قائم رہ سکتا ہے۔ ایک وقت ضرور ایسا آتا ہے کہ صحت مند سماج مفروضہ اخلاقیات سے کنارہ کش ہو کر جائزہ لیتا ہے۔

علوم و فنون نے جس قدر دماغی دریچے کھولے ہیں اسی قدر ہمارے نقاد سمٹتے جارہے ہیں اور سننے میں آتا ہے کہ بڑے فن کار کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ اس کا کوئی پیغام ہو۔ اوّل تو اس کی ضرورت قطعی نہیں ہے۔ نام و پیغام وہ کرتا ہے جو کسی تحریک سے وابستہ ہوتا ہے۔ صاحب فن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے قاری کو کوئی پیام بھی پہنچائے۔ ؟ اس کا سب سے بڑا پیام خود اس کا فن ہوتا ہے۔ اور ہم کو اس سے یہ مانگ نہیں کرنی چاہئے کہ وہ اس کے علاوہ بھی کچھ دے سکتا ہے یا دیتا ہے جن لوگوں نے اس طرح کا عمل کیا ہے حقیقتاً انھوں نے اپنے شعر و ادب کو آلۂ کار بنایا ہے اور اپنی خوبیوں کو ناکافی سمجھ کر دوسری چیزوں کا سہارا لیا ہے فن بذات خود ایک متاع عزیز ہے۔ یہ شرک گوارہ نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے بھی اس کا شریک تلاش کیا ہے وہ فطرتاً مصلح اور ریفارمر تھے۔ یا اپنی فنی صلاحیتوں پر پورا پورا اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے اس ہنر نے ان کو گرانقدر بنا دیا اور قدر دلوں

کی اکثریت ہو گی لیکن ایک شعر وادب کے نقاد پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ چوں کردہ تو حکم لگائے گا کمال نگارش پر۔ اگر اظہار جذبات میں اسلوب نگارش کا حسن اجاگر نہیں ہوا ہے تو بات کتنی ہی وقیع اور جاندار کیوں نہ ہو صدا بہ صحرا بن کر رہ جائے گی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رجحان فکر اور مذاق نگاہ بدلتا رہتا ہے۔ اور علامہ وحشت کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ انھوں نے سیاست کا لباس نہیں پہنا ہے اور ایک لیڈر بن کر سامنے آنا گوارا نہیں کیا ہے۔ لیکن ہم ان کی اس روش کو انگریز پرستی یا قومی آزادی کی مخالفت نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کچھ بنگال اور خصوصیت سے کلکتہ کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے پنجہ گاڑ دیے تھے۔ کم و بیش ہر محلہ میں عیسائی آباد تھے۔ اور شاید ہی کوئی گھرانا ایسا ہو جہاں سے ان لوگوں کا رابطہ نہیں تھا۔ انقلابی ترانے ضرور گائے جا رہے تھے۔ انگریزوں کی غلامی کا جوا گردن سے اتارنے کی یقینی سعی بلیغ کی جا رہی تھی لیکن انگریزوں کی صحت مند دین سے بھی کوئی منکر نہیں تھا۔ فرنگیوں کا جبر و تشدد تو ناقابل برداشت تھا لیکن ان کی اچھائیوں سے لطف اندوز ہونے کا بھی مذاق عام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انگریزی زبان کا بائی کاٹ کرتے جہاں اور ریاستوں میں مہاتما گاندھی کے کہنے پر آنکھ بند کر کے چلے وہاں رابندر ناتھ ٹیگور کی اسیع نظری کے نتیجے میں زبان سیکھنے سے باز نہیں آئے۔ اور کلکتہ کی بیشتر آبادی میں اچھا خاصا انگریزی کا چلن رہا۔ اور دیگر صوبوں کے مقابلے میں یہاں کے لوگ کچھ دنوں کے لئے دامن بچا کر ترقی کی دوڑ میں آگے نکل جانے سے باز نہیں آئے پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رضا علی وحشت انگریزی شعبدہ بازوں کی حکمت عملی کو بے نقاب کرنے میں کسی سے پیچھے رہے ہیں۔ اور ہندو مسلم منافرت کی جو دیواریں کھڑی کی جا رہی تھیں اس کا احساس ان کو نہیں تھا اور انھوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ

ترے عشوے بھڑا دینگے مسلماں کو مسلماں سے ترے غمزے لڑا دیں گے برہمن کو برہمن سے

جناب رضا علی وحشت غزل گو تھے ان کا اپنا ایک انداز تھا اور سیاسی پیچ وخم سے متاثر ہونے پر بھی شاعرانہ بانکپن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہمارے نقاد کو انھیں انکے فریم میں جڑکر خوبیوں وخامیوں کا پتہ لگانا چاہیے یہی سعی کامران کہلائے گی اور آنے والی نسلیں ہمارے شعور ونظر کو حقیر نہ سمجھیں گی۔ سب کا عرفان ایک طرح کی عینک آنکھوں پر چڑھانے سے ممکن نہیں ہے۔ ؏

ہر گل را رنگ بوئے دیگر است

کافی غور وفکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ادب پروپیگنڈا نہیں ہے نہ کسی سیاسی اخلاقی مذہبی یا معاشی تحریک کا آلہ کار بن کر اپنی جس صفت برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ میں اسے محض جنسیات کا ترجمان بھی نہیں مانتا۔ بقدر ضرورت اور حاجت بیک وقت بہت سی چیزوں کا مرکب تصور کرتا ہوں لیکن یہ ترکیب بھی اگر "عمداً" کی گئی ہے تو قطعاً حسن نہیں ہے بلکہ فن کار کی داخلی خواہش سے بروئے کار آئی ہے تو بے شک ہنر ہے۔ اسی لئے میری نظر میں ایک بڑے صاحب فن کی تخلیق بہت سی چیزوں کی کشید ہوتی ہے۔ وہ فلسفی صوفی ملّا یا مبلغ تو نہیں ہوتا ہے لیکن ان سب کی صفات اس میں بدرجہ اتم ہوتی ہیں۔ ادیب وشاعر کی اپنی ایک منزل ہوتی ہے اور اپنی ایک آواز اور ایک پکار یہی وجہ ہے کہ میں ادب کو خانوں میں بانٹنے کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ اسلامی ادب معاشی واقتصادی ادب جنسی ونفسیاتی ادب وغیرہ وغیرہ کی تقسیم میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ شعر وادب میں جب تک جمالیاتی عنصر کی فراوانی نہ ہو اس وقت تک فنون لطیفہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ہر موضوع کو فن کار کا احساس جمال دقیع بناتا ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہ دیکھنا فرض اولین نہیں ہے کہ کیا کہا گیا ہے؟ بلکہ یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ کس طرح کہا گیا ہے؟ مقصدی ادب کا میں دشمن نہیں ہوں لیکن اس

میں زیادہ تر زور اپنی بات پر دیا جاتا ہے اس کی پرواہ نہیں کی جاتی کہ بات کتنے موثر اور حسین انداز سے کہی جائے اور کتنے دلکش و مسحور کن لہجہ میں بیان کی جائے بلکہ تمام تر توجہ اس طرف مبذول فرمائی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ ذہن نشین ہو جائے چنانچہ ڈاکٹر اقبال کے بارے میں دار کاشمیری رقم طراز ہیں کہ انھوں نے اپنے معترضین کے پیش نظر ہے ذوقی کو ایک خط تحریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ میں زبان و محاکات کے لیے شاعری کب کرتا ہوں؟ میرے ذہن میں کچھ مسلمانوں سے متعلق مسائل ہیں جو میں اس پردے میں ان تک پہنچانا چاہتا ہوں" معلوم یہ ہوا کہ ایسے لوگ شعر و ادب کی صفات پر زور نہیں دیتے بلکہ جو ان کا مقصد ہے اس پر نگاہ رکھتے ہیں۔ چاہے فن کی ملک کے ملبوس میں جھول آئے۔ یا اس کا حسن ماند پڑ جائے ان کے سامنے اپنا ذاویہ نگاہ ہوتا ہے فن کا جمالیاتی عنصر نہیں۔ اسی طرح اسلامی ادب بھی ہے اس کا احترام کرنے میں کوتاہی نہیں کرنا چاہتا اور سر آنکھوں پر جگہ دینے کو کے لیے بھی تیار رہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ادب کو کیوں وابستہ کیا جائے۔ اور یہ رول شاعر و ادیب کیوں ادا کریں؟ اس کے لئے واعظ اور مبلغ کیا موجود نہیں رہے ہیں کہ ان کا منصب بھی ارباب فن کو تفویض کیا جائے اور وہ اپنی صلاحیتوں کو ہیئت سے زیادہ مواد پر خرچ کریں؟ یہ بجا ہے کہ شعر و ادب کے پردے میں جو بات کہی جاتی ہے وہ زود اثر بھی ہوتی ہے اور جلد ہی دلنشین بھی ہو جاتی ہے مگر اس کی بدولت جو فن کارانہ عمل میں فرق آتا ہے وہ کچھ کم خطرناک نہیں ہے؛ اپنے لب ولہجہ کو جاندار ثابت کرنے کے لیے تو بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ کب نہیں شعر و ادب نے پروپیگنڈے سے رشتہ جوڑا؟ کیا چشم میگوں عارض تاباں اور لب و لعل افشاں کی تشہیر کا یہ آلہ کار نہیں رہے ہیں؟ میں عرض کر دوں گا کہ جن لوگوں نے ان تمام خوبیوں کا پروپیگنڈا کیا ہے اور اپنے

فن کارانہ عمل کو اس بدعت میں مبتلا ہونے دیا ہے وہ نہ تو قابل قدر ہیں نہ حال میں مدح قرار دئے جا سکتے ہیں نہ ماضی میں غلطی کسی سے بھی سرزد ہو ضرور قابل گرفت ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ اپنے دل کی آواز دبا دیں اگر آپ کا لاشعور قبول کرتا ہے اور داخلی پکار فن کا لبوس اختیار کرتی ہے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن آپ جواب الجواب کے تقاضے پر عمل کرتے ہیں اور مبلغانہ رول ادا کرتے ہیں تو فوراً چوری پکڑی جاتی ہے اور ایک صاحب فن کی یہ ادا بھی نہیں لگتی ہے۔ یہ کوئی منطقی بحث نہیں ہوئی کہ شخصی حکومت نے تو بہت اپنے مفاد کے لئے جائز کر رکھا تھا وہی رخ بدل کر ہم بھی روا قرار دے رہے ہیں؟ شخصی حکومتیں تو بہت کچھ اپنے مفاد کے لئے کرتی ہیں اور ان پر انگلی اٹھانا بھی بے کار سمجھا جاتا ہے لیکن جمہوری عہد میں وہی انداز حکمرانی رہے تو کیوں نہ چاروں طرف سے صدائیں بلند ہوں۔ برائی کا ازالہ مزید برائی سے ممکن نہیں ہے نہ یکساں برتاؤ پسندیدہ ہے ادیب و شاعر ہمیشہ تڑپ اٹھتے ہیں اور اپنے اپنے دائرے میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور یہی وہ حق گوئی ہے جس کی بنا پر ان کی آواز کسی بھی ایسی تحریک کو پسند نہیں آسکتی جو ان سے میل نہیں کھاتی کہیں ان کو غدار آزاد خیال سرکش باغی بے دین لامذہب اور گمراہ کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے اور کہیں سرمد و منصور کی طرح دار پر کھنچوا دیا جاتا ہے اب تریاق بھی ہے اور زہر ہلاہل بھی۔ اسی لئے ایسے لوگ اس جہان رنگ و بو میں سرسبز نہیں ہو سکتے جو زمانہ کی ہوا دیکھ کر قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے داخلی وجود کا احترام نہیں کرتے بلکہ خارجی پیکر کے مطالبات پورے کرتے ہیں غالب کو اسی روش کے پیش نظر فرمانا پڑتا تھا ع

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آپ اسے محض شاعر کی بزدلی سمجھ قرار دیکر نظر انداز نہیں کر سکتے. بلکہ غور و فکر سے کام لیں گے تو معلوم ہوگا کہ کرب اور بےچینی مضمر ہے. وہ جانتا ہے کہ مسائل تصوف صحیح طور پر بیان کر رہا ہے دوسروں سے کچھ آگے ہی بڑھ کر سوچ رہا ہے اور معاشرہ کی بجا تربیت کر رہا ہے لیکن بادہ خوار ہے اور سماج نے یہ اتنا بڑا جرم بتایا ہے کہ اس کو ولی نہیں سمجھا جائے گا۔ ولیم ندر الیر نے بہت درست لکھا ہے کہ ہر دور میں حساس شعراء نے خون جگر پیا ہے. چونکہ وہ بناوٹ سے کوسوں دور ہوتے ہیں. تصنع کو اپنی دنیا میں جگہ نہیں دیتے بلکہ جیسے کچھ دکھائی دیتے ہی سچ مچ ہوتے بھی ہیں. یہ ظاہر و باطن کی یکسانیت معاشرہ اخلاق مذہب اور آئین کے لئے کبھی پسندیدہ نہیں رہا ہے. نقاد کو ان حدود سے آگے نکل کر صاحب فن کا ادراک و شعور تلاش کرنا چاہیے کہ اس نے اپنی جمالیاتی پسند کے مطابق کتنے حسین گل بوٹے بنائے ہیں اور کس طرح ہمارے احساس لطیف کو مہمیز کیا ہے.

ادیب و شاعر کی گفتگو کو سمجھنا آسان نہیں ہے ایک نقاد کو ڈوب کر اس کے جذبات کا پتہ لگانا پڑتا ہے اور سمجھنا ہوتا ہے کہ کس جذبے کے ماتحت انھوں نے گل افشانی کی ہے کسی کو قصیدہ نگار یا ہجو ملیح کا مرتکب قرار دیکے کوئی حکم لگا دینا بھی صحیح نہ ہوگا. ہمیں یہ ڈھونڈھنا پڑے گا کہ فن کار کی فکر کا سوتا کہاں ہے اور وہ کس کیفیت کے ماتحت قصیدہ یا ہجو کہنے پر تیار ہوا ہے. میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عام لوگوں کی بہ نسبت اہل فن کچھ زیادہ حساس ہوتے ہیں گرم و سرد کا اثر فوری طور پر قبول کرتے ہیں اور ان سے یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ان کے لئے راہ میں کانٹے بچھائے اور وہ اپنی زبان میں اس پر اظہار خیال نہ کریں اور کوئی انھیں خفیف سا مرہم بھی وقت پر فراہم کرے اور وہ اس کے گن نہ گائیں آپ اس کے ماتحت نہ تو انھیں کسی کا دشمن ثابت کر سکتے ہیں نہ مصاحب اور خوشامد خود کہہ سکتے ہیں تاثرات کا مطالعہ لطیف مزاج لوگوں کے

لئے بڑا نازک ہوتا ہے۔ انھیں معمولی سی بات دل کو لگ جاتی ہے اور خفیف سی نگاہِ
کرم بہت کچھ معلوم ہوتی ہے۔ میں وہ رکھوں جاؤں اور اپنے ہی اوپر قیاس کیوں نہ
کروں۔ حضور نواب صاحب جن کا اصل نام محمد حسین خاں ہے اور خاندانِ شاہی
سے تعلق رکھتے ہیں عرصے سے میرے کرمفرما ہیں میں ان کی سیاسی سرگرمیوں ادبی دلچسپیوں اور
مختلف انجمنوں سے گہری وابستگی سے بھی آگاہ ہوں۔ لیکن ایک ملاقات میں انھوں نے مجھے
سہولیت پہونچانے کے لئے جو پیشکش کی اس نے دل و دماغ پر بعید اثر ڈالا اور میں ان
کو اپنا سرپرست سمجھنے لگا۔ اسی طرح میری نور دیدہ رضیہ سلطانہ اور اس کے شوہر عظمت
میاں نے میرا ہاتھ بٹانے میں خاطر خواہ حصہ لے کر مجھے جیت لیا۔ اب اگر میں حضور نواب
کا گن گاؤں یا اپنی بیٹی اور داماد کو سر آنکھوں پر جگہ دوں تو آپ اسے کیا کہیں گے؟
وقت گزر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ اور حساس لوگوں کا متاثر ہونا نہ کسی جذبہ
کا رہین منت ہوتا ہے نہ کسی اثر کا۔ بلکہ یہ ان کی زود حسی ہے جو ان کو نہیں بخشتی۔
ایک نقاد کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ کسی پر کوئی حکم لگانے سے پہلے اس کے
مذاق و معیار کو بھی پرکھ لے۔ چونکہ اس میں بھی خلاقانہ صفت ہوتی ہے اس لئے خالق
کی دل و دماغ کی ساخت کو کبھی نہ فراموش کرے۔ غالب کی آخری تاجدار ہند کی شان
میں قصیدہ نگاری بیسی ردیّ کا منظوم شکریہ ادا کرنا اور اپنی پنشن کے لئے دہلی سے
کلکتہ تک کا سفر کرنا کس جذبے کا رہین منت رہا ان پر بھی نگاہ ڈال لینا بہت ضروری
ہے ورنہ بڑی حد تک ہماری پرواز خلائی ہوگی۔ یہ حکم لگا دینے تو بہت آسان ہے
کہ اگر کوئی غالب کا معتقد نہیں ہے تو ہم اسے شاعر ہی نہیں تسلیم کرتے لیکن اس دور
کو سمجھنا آسان نہیں ہے جس نے کسی کو گن گانے پر مجبور کیا یا ہجو لکھنے پر۔ ایک نقاد
صاحب فن کے حقیقی قریب پہنچے اسے محض بندھے ٹکے اصولوں پر اپنی عمارت
نہیں کھڑی کرنا آتی ہے۔ سیاسیات نے اپنی ضروریات کے ماتحت بہت سی

باتیں کہی ہیں اور بظاہر دل کو بھی لگتی ہیں لیکن شعر و ادب کو پرکھتے وقت خالی الذہن ہونا بہت ضروری ہے چوں کہ نقد و نظر میں آمیزش کی کوئی گنجائش نہیں ہے نہ ادب کو ذریعہ قرار دینے سے بات بنتی ہے۔ الگ الگ منطق ہے۔ اور ادیب و شاعر کا فن حقیقتاً کسی کا ذریعہ اظہار نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنی جگہ خود ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اور کف دست پہ جلتی ڈلی دیکھ کر غالب کا لب کشا ہونا ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم شاعر کے اسلوب نگارش کو پرکھیں اور یہ دیکھیں کہ کف دست پر جلتی ڈلی نے بھی اس کے جذبات میں کیسی ہلچل مچائی تھی جب تک ہماری نگاہ میں شعر و ادب کے تہ در تہ پردوں کو اٹھانے میں کامیاب نہیں ہوں گی اس وقت تک ہم صحیح منزل تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔

آج مصوّر فطرت خواجہ حسن نظامی کی تخلیقات کو پڑھ کر زیادہ تر لوگ زبان و بیان کا ان کو بادشاہ تو کہتے ہیں لیکن اس پر کم ہی نگاہ جاتی ہے کہ بات سے بات پیدا کرنا معمولی چیزوں کو اپنے انداز نگارش سے چمکا دینا اور فرش سے عرش تک پہونچا دینا ان کی چشم فسوں ساز کا ادنیٰ کرشمہ تھا میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ نقد و نظر میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں اور اب وہ دور نہیں رہا ہے کہ کوئی یہ کہکر اپنی بات ختم کر دے۔ ع

پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی

لیکن یہ بھی فراموش کرنے کی چیز نہیں ہے کہ ادب وہی زندہ رہتا ہے جو اپنی خصوصیات کو باقی رکھتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز صحیح نہ ہوگا کہ احتجاج ادب کی دائمی قدر ہے۔ ہاں اس قسم کی روایات ضرور پرانی ہیں۔ مگر احتجاج کا تعلق زیادہ تر ہنگامی حالات و واقعات پر مبنی ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس قسم کے ادیب و شاعر کی ادبی شہرت نہ دیرپا ہو سکتی ہے نہ موثر۔

یہی سبب ہے کہ اسے جو نوک پلک سنوارنے میں لذت حاصل ہوتی ہے اور زلف شب دراز میں موتی پرونے میں لطف آتا ہے وہ اس کا موقع ہی نہیں دیتا کہ وہ گھر دایاں پر سوچے اور معاشی واقتصادی مسئلہ کی گتھیاں سلجھائے۔ لہٰذا شعر وادب کے نقاد کو بھی محض رنگ و بو کا نوٹس سے چھونا بجا نہیں اور فنکار کے فن کا عرفان حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے تو اسے یہ دیکھنا پڑے گا کون واقعی حقیقی صاحب فن ہے اور کس کے یہاں یہ ہنر ریاض اور علم کی برکت سے نمایاں ہوا ہے۔ اس کے بعد اس کے قلب کی گہرائی تک رسائی حاصل کرتے ہوئے یہ سمجھنا پڑے گا کہ اس کا زاویہ نگاہ کیا ہے۔ اور کون سی کسوٹی اس کے فن کارانہ عمل کو اجاگر و روشن کر سکتی ہے۔؟ یونان کی مشہور شاعرہ سیفو جن دنوں ذاتی طور پر بحران سے دوچار تھی اور اس کے ملک وگردوپیش کے حالات بھی دل شکن تھے ان دنوں بہترین رومانی نظمیں کہہ رہی تھی اور غم دوراں کا اظہار ضروری نہیں خیال کر رہی تھی۔ کون جانتا ہے کہ کس پر وقت کیونکر اثر انداز ہوتا ہے اور کس کے لئے کیا صورت سکون بخش ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شیطان کے گھر بھی ولی پیدا ہوتے ہیں لیکن عام طور پر ماحول تربیت اور موروثی حالات ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک زاہد و عابد کے گھر میں جو بچے پروان چڑھتے ہیں ان کا مذہبی رجحان یقیناً قوی ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس جو نسل ایسی گود میں پرورش پاتی ہے جہاں لہو و لعب نہ محض مشغلہ نہیں بلکہ ذریعہ معاش بھی ہے اس کا ثابت قدم رہنا اگر محال نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس لئے نقاد کو ہر صاحب فن کے لئے ایک ہی معیار اختیار کرنا راس نہیں آسکتا۔ اسے یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کون کس گھرانے سے متعلق ہے اس کے کیا مفروضات و عقائد ہیں۔ تعلیم و تربیت نے کہاں تک اس کو نکھارا و سنوارا ہے اور حیات و کائنات کو کس منظر سے وہ دیکھتا ہے۔

یہی عرفان اسے بڑی حد تک صحیح منزل پر پہنچا سکتا ہے اور اسی لئے میرا مستحکم یقین ہے کہ نقاد کے لئے زیادہ سے زیادہ علوم و فنون کی واقفیت لازمی ہے تاکہ وہ فن کار کی فنی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لئے لکیر کا فقیر نہ بنا رہے۔ تنقید کرتے وقت ہمیں بالکل خالی الذہن ہونا پڑے گا اور مومن و کافر و بد و پارسا میں کوئی تفریق نہیں کرنا پڑیگی نہ یہ دیکھنا پسندیدہ ہوگا کہ کس نے ہمارے مزاج کے مطابق عمل کیا ہے۔ ایک نقاد فی نفسہ نہ صاحب ایمان ہوتا ہے نہ کفر میں غلطاں و پیچاں۔ اس کا کام تو صرف اتنا ہے کہ فن کار کے داخلی وجدان تک رسائی حاصل کرے اور انداز بیان کی قدر و قیمت مقرر کرے۔ بس۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مواد کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ ؟ ہے اور بلا شبہ ہے لیکن جب تک وہ موثر دل کو چھو جانے کے انداز میں ہمارے روبرو نہیں آتا اس وقت تک نہ اس کے جوہر کھلتے ہیں نہ روح میں رچتا بستا ہے۔ یہ اسلوب نگارش ہی کی برکت ہوتی ہے کہ وہ قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر ہمارے اندر ایک تہلکہ و انقلاب برپا کر دیتا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ تہلکہ و انقلاب

برعکس صورت میں ہو اور بعض لوگوں کو پسند نہ آئے۔ تو شعر و ادب کے نقاد کو کوئی بحث نہ ہوگی۔ اس لئے کہ دنیا بہت بڑی ہے اور ہر مزاج و خیال کے لوگ اس کی آغوش میں بستے ہیں کیا ضروری ہے کہ تجربات ہم کو بھلے وہی اور دل کو پسند ہوں۔ لیکن ایک نقاد ان حدود سے دور ہوتا ہے وہ اپنے اظہار خیال میں کسی کا پابند نہیں ہوتا ہے نہ کسی فن پارے کو مومن یا کافر ہو کر پرکھتا ہے اس کے پیش نظر اپنا منصب ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہمارے فرائض کیا ہیں اور کہاں سے تجاوز کرنا ہمارے کردار میں داخل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ متوازن تنقید ہنوز ہمارے یہاں عنقا نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ہم نے مطالعہ تو بہت کچھ سیکھا ہے اور لکھ پڑھ کر اصناف ادب میں سے صنف تنقید میں کافی مہارت حاصل کی ہے لیکن دیدہ بینا اور شعور نظر کا زیادہ تر فقدان ہے۔ اور اس کا سبب

بڑا سبب یہ ہے کہ مجتہد کم مقلد زیادہ منظر عام پر آئے ہیں۔ اور یہ اسلئے ہوا ہے
ہمارے معاشرہ میں شوقین لوگوں کی کمی نہیں جس طرح شاعر بہ کثرت رونما ہوئے ہیں
اسی طرح ادیب و نقاد بھی اپنے جلوے دکھا رہے ہیں اگر پہلے ہی قدم پر یہ بات ذہن نشین
کرا دی جاتی کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا ایک ہی راہ پر چلنا اور
بھی مشاغل ہیں تحصیل شہرت کے لئے اور جس کی جس طرف طبیعت مائل ہو اس طرف
اس کو متوجہ ہونا چاہیے تو شاید شعر و ادب کی دنیا میں یہ افراتفری دکھائی نہ دیتی۔ اور
وہی لوگ اپنے کمال فن کا جوہر دکھلاتے جو واقعی اس کے اہل ہیں۔ سامعین کا تو ہجوم
کوئی جرم نہیں پرورش ترقی پذیر باذوق اور خوش مذاق سماج کی علامت ہے۔ اور یہ معلوم
ہوتا ہے کہ ہم فنون لطیفہ سے کتنا گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ لیکن اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا
صحیح طور پر اندازہ نہ کرتے ہوئے جب تعاری سے زیادہ فن کار خلق ہونے لگتے ہیں تو
یقینی توازن برقرار نہیں رہتا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے کہ
بحر بے گہرائی تو اس میں ڈوبنے سے آتی ہے۔ اور خیال کا معاملہ یہ ہے کہ نادر نہ جب
بھی اپنی سچی تخلیقی سطح پانا اس وقت تک کہاں ممکن ہے جس وقت تک وجدانی فنکار
نے حرکت و عمل کے گل بوٹے نہ کھلائے ہوں۔ سہل پسندی کا کوئی منکر نہیں ہے اور
سب کو اس کا اعتراف ہے کہ ایک عام آدمی کبھی کبھار راہ چلتے کوئی ایسا فقرہ ایجاد کر
جاتا ہے جو سو پر بھاری ہوتا ہے اسی طرح شعر و ادب کا بھی معاملہ ہے وہ اپنے کو ان
زبانوں سے بھی کہلوا لیتے ہیں جن کا وزن نسبتاً اعلیٰ ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی
نہیں کہ کہنے والے نے شعوری عمل کیا ہے اور اس کا فرمایا ہوا لائق پذیرائی بھی ہے
حقیقتاً یہ شعر و ادب کی اپنی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ان لبوں کو بھی شیریں بنا دیتے ہیں جو مطلق
سے بظاہر خالی ہیں۔ اسی لئے خلاقانہ عمل غیر خالق کے مان کی چیز نہیں ہے۔ نہ ہم ہمیشہ
اس سے اس کی توقع کر سکتے ہیں۔ اکثر اوقات میں لب کشا ہونا اس کی علامت نہیں

ہوا کرتا کہ وہ ہر موقعہ پر اپنی اسی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کریگا۔ اگر سیکڑوں اور ہزاروں اشعار کے ہجوم میں دو چار دس اشعار ایسے بھی نکل آتے ہیں جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائیں تو ان کی کوئی مستقل اہمیت نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ نقاد کا تخلیقی کارنامہ اسی وقت دل و دماغ کو جیتنے میں کامیاب ہوتا ہے جب وہ زیادہ تر اپنی اصابت رائے کا مظاہرہ کرتا ہو یوں تو کسی سلسلے میں کوئی رائے دینا اور اچھے یا برے کا حکم لگا دینا دشوار نہیں ہے شعر و ادب ہمارے معاشرہ میں اس قدر مسعود کیوں ہیں کہ جو لطف اندوز ہونے کے لئے مشاعروں میں نہیں جاتا اور ادبی محفلوں میں شریک نہیں ہوتا وہ بھی کچھ نہ کچھ کہہ دیتا ہے تو سب کو ایک ہی کسوٹی پر پرکھیں اور سب کی رائے کو نہ قبول کریں تو کیا ہمارے لئے یہ بجا ہوگا؟

بہت سے وہ لوگ ہوتے ہیں جو شاعر کا زیر و بم پڑھنے کا انداز اچھی طرح سیکھنے کے لئے جاتے ہیں یا وقت گذاری کے لئے ایسی نشستوں میں شریک ہو جاتے ہیں تو کیا سب کا خیال اس کا مستحق ہے کہ سر آنکھوں پر قبول کیا جائے اور روشنی میں لائی جائیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہرگز نہیں سمجھا نہیں۔ ابھی کچھ یہ سمجھنا درست معلوم ہوتا ہے کہ خلاقانہ عمل صرف خالق ہی کے بس کا روگ ہے۔

خالق اسکو نہیں کہتے جو مطالعہ اور کتب بینی کی برکت سے لب کشائی کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے یقینی پڑھنا بے حد قابل قدر ہے لیکن تخلیقی صلاحیت کے لئے ذہن کی نوعیت بھی ضروری ہے جب تک ہمارے ذہن و دماغ کے جالے صاف نہ ہوں گے اور ہم اپنے خیالات سے تمام مخالف خیالات کو سننے و پڑھنے کی تاب نہ لا سکیں گے اسوقت غیر جانبداری کے ساتھ کوئی رائے کیا قائم کر سکیں گے۔ نقاد کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ وہ پہلے سے کچھ نقوش کو اپنے دماغ میں ثبت کئے رہے اور مخالف کی گفتگو یا تحریر کو تردید کی تند و تیز چھری پر چڑھا دے۔ ایسا شخص تو کبھی بھی

کسی کو دیانتدارانہ طور پر منہ لگا ہی نہیں سکتا نقاد کے قلب میں بڑی وسعت ہوتی ہے وہ اگر اپنے ہمنواؤں کو سنتا ہے تو اپنے مخالفین کی بھی اسکے سامنے سب کی حیثیت مساویانہ ہے اور وہ اچھے برے دونوں سے کسب فیض کرتا ہے گندگی یا فحاشی معاشرے کے لئے لعنت ہیں اور ضرور ہم یہ چاہیں گے کہ اس طرح کی باتیں بچوں اور عورتوں کے کانوں میں نہ پڑیں لیکن خود کو کیسے ہیئت اور حقیقت جاننے سے بچا سکیں گے۔ ہمیں تو دل پر پتھر رکھ کر ان کا مطالعہ کرنا ہی پڑے گا اور سمجھنا ہی ہوگا کہ واقعی ان کی اصلیت کیا ہے کس سماج اور کس تہذیب میں کب کب انکا کیا تصور رہا ہے اور کہاں کہاں کس عنوان سے ان کا ظہور ہوتا رہا ہے۔

معلومات کے لئے ہر چیز کا جاننا و سمجھنا ایک نقاد پر واجب ہے اور جتنی عمر جس کو نصیب ہوتی ہے وہ اگر اتنی رطب و یابس کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے تو قطعی گرانقدر ہے اور سر آنکھوں پر جگہ دینے کے قابل۔ میں نے اکثر موقعوں پر اسکا اعادہ کیا ہے۔ ایک نقاد کو عصبیت سے کوسوں دور رہنا چاہئے وہ مذہبی عصبیت ہو یا لسانی و سماجی دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنے لوگوں کو صف اول میں لا کھڑا کرنے کے لئے ہم اس سے بھی باز نہیں آتے ہیں کہ

دوسروں سے ان کا موازنہ کریں۔۔ اور حتی الامکان منفرد اور آگے نکل جانے والا قرار دیں ... یہ محنت پیگاؤ یہ تعلق کوئی بری چیز نہیں ہے.. لیکن عالمانہ گفتگو میں ضرور محل نظر ہے

ہم ایک بالغ نظر شخصیت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ جملہ مسائل میں متوازن حالات سے ہماری رہنمائی کرے گی۔

تنقید ایسا کام نہیں ہے کہ جو محض خوش فہمی کی بدولت آسان ہو جائے۔ ایک نقاد کو نہ صرف زیادہ سے زیادہ علوم و فنون کی آگاہی لازمی ہے بلکہ خود احتسابی بھی ضروری ہے وہ اپنی ذات اور صلاحیتوں کا خود جائزہ لیتا ہے اور اپنا حساب کتاب آپ کرتا ہے۔ اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ قلم اٹھانے سے پہلے اپنے آپ کو تولے اور پتہ چلائے کہ جس وادی میں وہ قدم رکھ رہا ہے اس کا حق بھی ادا کر سکے گا یا نہیں؟ محض اپنے پسندیدہ لوگوں کو پڑھ لینے کے بعد یہ اختیار حاصل نہیں ہو جاتا کہ ہم مجموعی طور پر کوئی رائے قائم کر سکیں۔ نہ کسی نظریہ و افکار کو برتر ثابت کرنے کے لیے خامہ فرسائی کریں؟۔ اس قسم کا رول وہ لوگ تو ادا کر سکتے ہیں جو اخلاقی۔ مذہبی یا سیاسی مرد میدان ہوتے ہیں۔ علم و ادب کے نقاد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ جنبہ داری سے کام لے۔ میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ اچھوں کے ساتھ بُروں کو بھی پڑھنا ضروری ہے ورنہ یہ حقیقت ظاہر نہیں ہو گی کہ آپ اچھا کس کو کہتے ہیں اور بُروں سے مُراد آپ کی کیا ہے؟ نقاد کی حیثیت ایک مشعلِ نور کی ہوتی ہے۔ وہ ہم کو روشنی دکھاتا ہے اور اس کی ضیا باریا شعاعوں سے راہیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ حالی بلاشبہ منفرد انسان تھے۔ مقدمہ اُن کا رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ لیکن حرفِ آخر قرار دینے سے پہلے ہم کو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ سیاسی حالات اُن سے کیا تقاضہ کر رہے تھے۔ اور وقت سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اُنھوں نے کتنا کچھ لکھا ہے؟ اسی طرح سائنس اور ادب کی بات کرتے ہوئے ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ سائنس کسی مفروضہ پر مبنی نہیں ہے نہ یہ کوئی فلسفہ کی موشگافی ہے۔ بلکہ تجربہ کرنے والوں نے اپنے اپنے عہد میں کچھ تجربے کیے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کا انکشاف وہ کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ کے حلق سے ان کی باتیں نہیں اترتیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے کشکول میں ان کی معلومات سے

کہیں زیادہ خزانہ جمع ہے تو کون زبردستی کرتا ہے کہ بندہ پرور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں؟

ادب ہمیشہ سیمرغ کی داستان تک تو محدود نہیں رہ سکتا نہ مولانا شرر کی طرح غازیانِ اسلام کو دودھ کا دھلا ظاہر کرنے تک مقید ہو سکتا ہے؟ زندگی متحرک ہے بساطِ کائنات پر نت نئے مُہرے اُبھر رہے ہیں۔ اُن کے مسائل و تقاضے بھی مختلف ہیں۔ آپ پریم چند سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کریں گے علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی سے یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ وہ قدیم راہوں پر چلتے ہوئے دکھائی دیں گے؟

یہ صحیح ہے کہ سیاہ و سفید طاقتوں میں زمانے کے مطابق ہمیشہ رسّہ کشی جاری رہے گی اور شر کے مقابلے میں خیر کو زیادہ اُجاگر کیا جائے گا۔ لیکن یہ بھی گرہ میں باندھ لینا ہوگا کہ ہر عہد میں نیکی و بدی کا ایک ہی مفہوم نہیں رہتا ہے۔ قتل و رہزنی بہت بری بلائیں ہیں۔ لیکن اگر ایسے خونی درندے سماج میں ابھر آئیں جو اکثریت سے توانائی چھین لیں۔ اور ایسے خزانے چند لوگوں کے پاس جمع ہو جائیں جن کی بدولت تقسیم میں توازن باقی نہ رہے تو انھیں تہ تیغ کر دینا اور ان کی دولت کو چھین لینا بلاشبہ نیک عمل کہلائے گا بد عملی نہیں؟ ہر کام کا ایک محل ہوتا ہے ہم کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ کون سا فعل کتنے مناسب وقت پر ادا ہوا ہے۔ اور کس طرح شر نے خیر کا لباس پہن لیا ہے۔

بیسویں صدی کے فلسفیوں میں سب سے پہلے امریکہ کے دو فلاسفر ولیم جیمز اور جان ڈیوی کا نام نامی روشن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "کوئی خیال و نظریہ بذاتِ خود صحیح یا غلط نہیں ہوتا بلکہ ان کی صداقت اور قدر متعین کرنے میں ہم کو یہ ملحوظ دیکھنا پڑے گا کہ عملی زندگی میں ان کے اثرات اور نتائج کیا ہوتے ہیں۔"

اگر آپ غور سے دیکھیں تو ہم عملی زندگی میں اثرات دیکھ کر ہی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کس کا انداز فکر کتنا صحت مند ہے اور کون ہے جو ہمارے دکھ درد کا مداوا کرتا ہے؟ مذہب بھی وہی بھلا لگتا ہے۔ ہم کو جس نے غلامی سے نجات دلائی ہو۔ انسانی مرتبہ بلند کیا ہو۔ اور گام گام پر سجدے لٹانا بشریت کی توہین قرار دیا ہو۔ جب تک یہ رُخ روشن ہمارے سامنے رہا ہے ہم جوق در جوق اس کی طرف کھنچے رہے ہیں لیکن جب سے شہنشاہیت جاگیرداری اور سرمایہ داری نے اس سے سمجھوتہ کر کے اپنے مفاد کے لیے ارباب جبہ و دستار کو خریدا ہمارا وہ اعتماد و یقین بھی برقرار نہ رہ سکا۔ جو ماضی میں طرۂ امتیاز تھا۔ آپ اس اضمحلال کو کسی علم و تحریک سے کیوں جوڑتے ہیں اور اس پر کیوں نہیں توجہ فرماتے کو ہے۔

خود کردہ را علاج نیست؟

سائنس نے کبھی مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ نہ اپنی کوشش و کاوش کو حرف آخر کہا۔ اس کی تجربہ گاہ میں نت نئے تجربے ہو رہے ہیں اور آج وہ توانائی "کو سب کچھ قرار دے رہی ہے۔ کل ممکن ہے کہ اسکی تحقیق اور تفتیش کچھ اور صفت کا اعلان کرے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ غلامی کا جوا، گردن میں برقرار نہیں رکھنا چاہتی اور قدم قدم پر چھان بین کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ ایک بچہ جو شعور سے نابلد ہوتا ہے اور اشیاء عالم سے بخوبی آشنا بھی نہیں ہوتا ہے زبان کھلنے کے بعد اپنے والدین سے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سائنسداں بھی اسی نظریہ کے ماتحت لکیر کے فقیر بنے نقش قدم پر نہیں چل رہے ہیں۔ بلکہ خلاؤں میں پرواز کر کے ان کی اصلیت و ماہیت جاننے کے لیے بے چین و بیتاب ہیں۔ آپ نہ انھیں باغی کہہ سکتے ہیں نہ سرکش۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت

کے چوپایہ ہیں اور خلیفۃ الارض ہونے کا بجا طور پر کردار انجام دے رہے ہیں۔ ادب چونکہ زندگی کی پیداوار ہے اور جس دور میں حیات مستعار نے جیسی کروٹ لی ہے اسی دور میں ادب جو اس کی تخلیق ہے کم و بیش اس کا آئینہ دار رہا ہے ۔ اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے ۔۔؟ یہ زمانہ مختلف علوم و فنون کا ہے۔ ان گنت تحریکیں اور نظریات منظر عام پر ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے فن کار ان سے متاثر نہ ہوں۔؟ اور محبوب کے گول سے چہرے کو چاند سے تشبیہ دیتے رہیں؟ ادب و شعر کے رجحانات بدلنے کا اگر واقعی ہم پتہ لگانا چاہتے ہیں تو ان تمام علوم و فنون اور ان کی بدولت گردو پیش میں پھیلے ہوئے رجحان و افکار کو بھی محسوس کرنا ہوگا جو آج کے انسان کا سرمایہ حیات ہیں۔ اور جن کی بدولت اس کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں نمایاں تبدیلی ہوئی ہے ۔ انسانی مزاج نہ کسی تحریک کے موڑ سے مڑتا ہے۔ نہ جذباتی طور پر کوئی دیرپا اثر قبول کرتا ہے۔ اس میں بڑا ہاتھ ان چیزوں کا ہوتا ہے جن کو سننے و مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوتا ہے ۔ کتنے آج کے ارباب قلم ایسے ہیں جن کا موضوع سائنس رہا ہے ۔ اور انھوں نے پڑھ لکھ کر وہی نظریات اپنی گرہ میں باندھ لیے ہیں جن کو ہم مذہب کا باطل تصور کر بیٹھے ہیں۔ اور جن کی نفی کرنا سعادت خیال کر رہے ہیں ۔ اب وہ دور نہیں ہے کہ اپنے کو محدود کرکے یا مخصوص رنگ کی عینک آنکھوں پر چڑھا کر سب کچھ زرد یا لال بتایا جائے ۔ مذہبی حکومت کسی کو پیاری نہیں لگتی ہے اور کون یہ نہیں چاہتا ہے کہ ہمارے ہم عقیدہ حکمرانی کریں۔ اور ہمارے رسوم کی آزادانہ ادائیگی ہو؟ لیکن وقت نے خواب غفلت سے چونکا بھی دیا ہے اور بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ ہر جگہ یہ طرز سلطنت نہ قائم ہو سکتا ہے نہ وہاں کی رعایا کے لیے قابل قبول ۔ چونکہ دنیا میں ایسے خطے بکثرت ہیں

جہاں ہر خیال و عقیدے کے لوگ بستے ہیں۔ کہیں بھی کسی مخصوص فرقے کی حکومت قائم ہونا
ان کے لیے تو سازگار ہو سکتا ہے جو اُن کے ہم خیال ہیں یا جہاں ان کو ہر طرح کی آزادی
نصیب ہو سکتی ہے۔ نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو اپنا انداز حیات مختلف رکھتے ہیں لامحالہ ان کی ہمدردیاں
ان ہی ریاستوں کے ساتھ رہیں گی جو اُن کی ہم خیال ہیں یا جہاں اُن کے اعمال و خیال پر پہرے
نہیں بٹھائے گئے ہیں ایک ادیب و شاعر کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ محدود دائرے میں
اپنے خول میں سمٹا جائے اور سارے جہاں سے کٹ کر صرف اپنا ہی راگ الاپے۔
شعر و ادب پابندیوں کے متحمل نہیں ہیں۔ ان کا حسن تو آزادی ہی سے دوبالا ہوتا ہے اس لیے ہم بہت ابتدا سے
دیکھتے ہیں کہ فارسی و اردو کے شعراء بار بار عبد و معبود کے رشتہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور جبر و اختیار
کی بات کہتے ہیں ان کی تقلید نہیں کرتے جن کا یہ موضوع ہے۔ آپ ان کو بے دین کہیں
یا گمراہ کہہ کر اُن کے فن کو صرف اس لیے حقیر نہیں قرار دے سکتے کہ انھوں نے ہمارے
ایسی باتیں نہیں کی ہیں۔ اور اپنی قوت تخلیق کے جوہر کچھ اور ڈھنگ سے مترشح
کیے ہیں ۔۔۔ یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ شعر و ادب کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے۔ جن
میں مصوری بھی شامل ہے اور اکثر مذاہب تصویر کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر
ممکن ہے کہ ان میں ربط پیدا ہو۔ اور ایسے لوگ کیوں نہ خالص دینی حکومت
میں ایک گھٹن سی محسوس کریں؟ ۔ کوئی بھی فلسفہ ہو اگر وہ انسانی مطالبات پر
پہرے بٹھاتا ہے اور ارباب فن کو پابند بناتا ہے تو عام لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا
اس وقت دنیا کے پردے پر سعودیہ عرب پاکستان اور خلیج میں اسی کا بول بالا ہے
لیکن آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہ وہاں کے عوام میں کتنی بے چینی پھیلی ہوئی
ہے ۔۔۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نہ زور و زبردستی سے رجحان فکر میں تبدیلی میں آتی
ہے نہ سب لوگ ایک طرح کے ممکن ہیں۔ لامحالہ کچھ تبدیلیاں ہوتی ہیں اور اُن کو نگاہ
میں نہ رکھنا انقلاب در انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے ۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ جس کا جو موضوع
ہے وہ اس کے بابت تبلیغ و اشاعت کے لیے آزاد ہے لیکن یہ اختیار اسے حاصل نہیں

ہے کہ اپنے سے متفق نہ ہونے والوں کو تہہ تیغ کرے یا باغی قرار دے کر تختۂ دار پر چڑھائے اور زبانوں میں تالے لگائے ۔ ادیب و شاعر کبھی اس طرح پر مقید نہیں ہو سکتے ہیں ۔ ان کا اپنا ایک انداز فکر ہوتا ہے اور ہر معاملہ میں وہ الگ رائے رکھتے ہیں ۔ اسی لیے کہیں بھی تشدد گوارا نہیں کرتے اور ایسی سیاست کی ہم نوائی نہیں کرتے جو یک طرفہ ہو ۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ روز ازل سے دو طاقتیں نبرد آزما ہیں اور پیدا کرنے والے ہی نے جب ان کو گوارا کیا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں ان کا قلع قمع کرنے والے ؟ ۔ ہاں ہمارا کام اتنا ہے کہ خیر و شر کی راہیں بتائیں اور جو جس راستے پر چلنا چاہے اس کے پیروں میں زنجیریں نہ پہنائیں ۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب انفرادی معاملہ ہے ۔ اجتماعی صورت میں اس کا نفاذ کبھی نہیں ہوا ۔ آج بھی بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جو پابند مذاہب ہیں اور ایسے افراد سے بھی دنیا خالی نہیں ہوئی ہے جہاں اس طرح کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی ۔ یہ تو اپنی سمجھ اور پسند کی بات ہے اس میں جبر کا کیا دخل ہے ؟ ۔ چونکہ جبر سے دل نہیں بدلا کرتے اور اعتقاد و یقین کا تعلق دل ہی سے ہے ۔ اور شاعر و ادیب اس حقیقت کو جانتے ہیں اور یہ بھی کہنے سے باز نہیں آتے ہیں ۔ ع ۔

آتی ہے دلہن بن کے مشیت کے جلو میں
آوارگیٔ آدم و حوا مرے آگے
(جوش ملیح آبادی)

خدا کو اہل جہاں جب بنا چکے تو فراق
پکار اٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے
(فراق گورکھپوری)

ایک نقاد کے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس طرح کے افکار یا اظہار جذبات

اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے اس لیے وہ ذوق کی آواز کو دل لگی قرار دے
اور فرمائے کہ ع۔

موذن مرحبا بروقت بولا   تری آواز مکے و مدینہ

..... اسے ہر قسم کے ذاتی تاثرات کا لبادہ اتار کر جائزہ لینا ہوگا
اور علامہ جمیل مظہری یا جوش ملیح آبادی کے افکار پر یہ حکم نہیں لگانا ہوگا کہ یہ
حضرات خدائی وجود کے تو منکر ہیں لیکن خدا ان کی بارگاہ میں خوب
خوب سجدے لٹاتے ہیں ۔ یہ اس کے اپنے مذاق کی بات ہوگی ۔ اور
تنقید میں اپنا مذاق راہ نہیں پاتا بلکہ ہمیں خالی الذہن ہوکر یہ دیکھنا
پڑتا ہے کہ کس نے شعر و ادب کا حق کس حد تک ادا کیا ہے
ایمان و یقین کی بات ہو یا کفر و الحاد کی کہی گئی ہو کس حسن کے ساتھ کہی گئی ہے
اصل میں دیکھنے کی چیز یہی ہوتی ہے۔ نقاد کس نظریہ کا ماننے والا ہے۔
یہ اس کا ذاتی فعل ہے لیکن شعر و ادب کا جائزہ لیتے وقت اس کا دخل
گوارا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ شعور و فکر کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو ... غیر جانبدار
ہوکر عیوب و محاسن کی پرکھ ہونا چاہیے۔ وہ یہ محسوس کر سکے کہ کہاں پر کس نے
کیا موتی ٹانکے ہیں اور کیسے کیسے گل کھلائے ہیں؟

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ مواد
پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے راکھ کے ڈھیر پر
حسین گلکاری کی ہو اور کوئی سونے چاندی پر سلیقہ کا کام نہ کر پایا
ہو۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ اپنے معیار پر فن کار کو
کھینچ تان کر لے آئیں اور زور بیان دکھانے کے لیے زمین و
آسمان کے قلابے ملائیں ۔ بلکہ ہمارے منصب کا جوہر اسی وقت

نمایاں ہوتا ہے جب ہم لکھنے والے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اُس کی کاوش کو محسوس کرتے ہیں۔

تمت بالخیر

(اختتامیہ)

میں اسے اپنی خوش نصیبی کہونگا کہ بالکل آخر وقت میں محب صادق دیرینہ کرمفرما جناب قمر عابد صاحب نے حق رفاقت ادا کیا وہ میرے قدیم بہی خواہ ہیں۔ میں ان کا ممنون کرم ہوں کہ عرصہ سے لیبیا میں اپنی صلاحیتوں کا جوہر دکھا رہے تھے کاش کچھ پہلے انکا تعاون حاصل ہو جاتا۔ اور میں اپنے دلی جذبات مترشح کر سکتا۔ بہر حال یہی غنیمت ہے کہ وہ کسی موڑ پر مل تو گئے اور میں مجروح سلطانپوری کی زبان میں یہ کہہ رہا ہوں ع

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

"کتابیات"

اس کتاب کو لکھنے میں مندرجہ ذیل کتب سے غیر معمولی رہنمائی کی

(۱) ادب اور ادیب .... ڈاکٹر سید اعجاز حسین

(۲) ادب کیا ہے .... آل احمد سرور

(۳) اردو غزل .... یوسف حسین خاں

(۴) اردو تنقید کا ارتقا .... ڈاکٹر عبادت

(۵) اردو شاعری پر ایک نظر ....

(۶) تاریخ پسند ادب .... عزیز احمد

(۷) نئے ادبی رجحانات .... ڈاکٹر سید اعجاز حسین

(۸) موسیٰ سے کارل مارکس تک .... سبط حسن

(انگریزی)

(۹) کریٹی سزم آف لٹریچر .... جان ارنسٹ

(۱۰) دی فلاسفی آف موڈرن آرٹ .... ریڈ البرٹ

(۱۱) دی تھیوری آف لٹریچر .... ویلک اینڈ وارن

(۱۲) واٹ از لٹریچر .... سارترے

(۱۳)

وغیرہ وغیرہ

سیاست اور ادب

ضیاؔ عظیم آبادی

یہ کتاب مصنف کا تجربہ ہے۔ اور حالات کا صحیح تجزیہ

اپنی اولین فرصت میں

ملاحظہ فرمائیے

زیر طبع

کاغذ نفیس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گیٹ اپ خوبصورت

لکھائی، چھپائی معیاری

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں

میری مندرجہ ذیل کتب ضرور

اپنی اولین فرصت میں

ملاحظہ فرمائیں

★ ادب و جنس
★ یگانہ چنگیزی حیات و فن
★ شاد عظیم آبادی پر ایک نظر

اور اب

تنقید و نقاد

یہ مجھ پر احسان نہیں بلکہ زبان و ادب کی قدردانی کا ثبوت ہے
اور آپ بلاشبہ قدردان ہیں

Allama Iqbal Library
258089
UNIVERSITY Library
258089

THE UNIVERSITY OF KASHMIR
ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN